ممتاز و مقبول شاعر قتیل شفائی کے کردار و کلام کا مفصل تعارف و انتخاب
قتیل سب سے جمیل
ضیا ساجد

مطرب، نغمہ گر، شگفتہ طبع، شیریں گفتار قتیل شفائی ترقی پسند شعرا کے قافلے میں اہل قافلہ کے ہمسفر بھی ہیں اور ان سے جدا بھی۔ اگر جذباتی اور نظریاتی معاملات میں ان کے دل و دماغ اپنے ہمرہوں کے ہم آہنگ ہیں تو اظہار اور ترسیل کے مقامات میں قتیل کی آواز منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔

فیض احمد فیض

آئندہ صدیوں میں جب بیسویں صدی کے چند بڑے اور اہم شاعروں کی فہرست تیار ہو گی تو اس میں قتیل شفائی کا نام بہر صورت شامل ہو گا کہ قتیل نہ صرف حسن اظہار کے معاملہ میں بلکہ حسن فکر کے معاملے میں بھی بڑا اور غیرفانی شاعر ہے۔

احمد ندیم قاسمی

قتیل شفائی برصغیر ہندوپاک کے ان منفرد اور ممتاز شاعروں میں ہیں جو اپنے لہجے سے الگ پہچانے جاتے ہیں انکی آواز میں ایسا رس اور لوچ ہے جس نے نظم اور گیت کے درمیانی فاصلے کو قریبا قریبا مٹا دیا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قتیل مانگی ہوئی آواز میں شعر نہیں کہتا وہ صاحب اسلوب شاعر ہے اس کا شعر اس کے نام کے بغیر بھی اسی کا شعر ہوتا ہے۔ اس نے جہاں اپنے فکر سے اجتماعی انسانی ذہن کو روشن کیا اور زندگی کو آسودگی بخشی وہاں اظہار و ابلاغ کی نئی نئی راہیں بھی تراشی ہیں۔ وہ فکر و فن میں سچائی کا پرستار اور رعنائی کا علمبردار ہے۔

سید ضمیر جعفری

قتیل شفائی نے اردو شاعری کو کئی جہتوں سے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور کوئی جہت ایسی نہیں جس میں ان کی انفرادیت اجاگر نہ ہوئی ہو۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

قتیل بلند آہنگی کے شاعر نہیں ہیں گیت اور گفتگو کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے شعروں میں خوشبو، شبنم، رنگ، بادل اور چاند کے جلوے زیادہ ہیں۔

پروفیسر محمد حسن

قتیل شفائی مزاج کے لحاظ سے کلاسیکی غنائی انداز کے شاعر ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انکا رشتہ لمحہ موجود کے ساتھ بہت گہرا ہے۔

شہزاد احمد

قتیل کی غزل کی شاعری اگر ایک طرف حسن و عشق کی واردات کی نقش گری ہے تو دوسری طرف اس کے آہنگ میں انقلابی فکر کی نغمہ سرائی بھی صاف سنائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

قتیل شفائی کی شاعری میں ان کا کرب چیخ یا شور بن کر نہیں ابھرتا اور نہ ہی تشنج کی کیفیت کو جنم دیتا ہے یہ ان کے منفی خواص یعنی نرمی، لطافت، خوش طبعی، جمالیاتی احساس اور محبت سے آمیز ہو کر داخلی نغمگی میں ڈھل جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابدی کاشمیری

قتیل

سب سے جمیل

مکتبہ القریش ○ قذافی مارکیٹ، اردو بازار ○ لاہور

ناشر : عبد الحفیظ قریشی
باہتمام : محمد علی قریشی
مطبع : نیر اسد پرنٹرز لاہور
سن اشاعت : 1995
تعداد : 600
قیمت : =/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار ' لاہور

شبنمیں شعر

کہنے والے

صوفی صفت

اظہر جاوید

کے نام

جو میرے لیے ہمیشہ

فرشتہ محبت

ثابت ہوئے

شئیل شفائی

جماعت دہم میں اردو اور فارسی زبان ہمیں منشی فاضل پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک آنکھ میں پھولا اور دوسری آنکھ میں سور کا بال تھا۔ جس کے سبب وہ بے حد بے دید اور بدلحاظ تھے۔ یہاں تک کہ مٹھائی اور کھٹائی کی دکان کے قریب سے گزرتے وقت اگر ان کی اپنی بھی رال غلطی سے ٹپک پڑتی تھی تو خود کو بھی صلواتیں سنانے سے باز نہیں آتے تھے۔

ان کی تنخواہ سے چونکہ انگریزی کے استاد شیخ نور اللہ کی تنخواہ چار ہاتھ آگے تھی اس لیے انگریزی زبان سے وہ تنخواہ واسطے کا بیر، بغض اور کینہ رکھتے تھے، کہتے تھے انگریزی ان لوگوں کی بھاشا ہے جو اگر صابن کی پوری گاچی کے ساتھ بھی نہالیں تب بھی ان کے گورے بدن سے میلی کچیلی بو بہتی رہتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ تھپڑ، ٹھڈے، مکے اور کبھی کبھی فرط وحشت سے ٹکر مار کر نصیحت کرتے تھے کہ اگر تم نے ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح الدین احمد بننا ہے تو جی اور شرط لگا کے اردو پڑھو، اردو بولو اور اردو لکھو۔

جب کہ شیخ نور اللہ اردو کو نہاری فروشوں کی زبان قرار دے کر ہمیں انگریزی زبان کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھانے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے اردو سے لو لگاؤ گے تو تمہارا دل حسد و تعصب اور تیز مرچ مصالحہ سے خواہ مخواہ لبالب بھر جائے گا۔

منشی فاضل کے پاس گوناگوں رنگوں والے نگینوں کی انگشتریاں تو بے شمار تھیں۔ شیروانیاں اور بیویاں البتہ ان کے پاس بس دو تین تھیں۔ شیروانیاں دو

اور بیویاں تین۔ چھوٹے بوڑھے بتاتے تھے کہ عروسِ اول سے متعلق جب انہیں کامل یقین ہو گیا کہ وہ برگ و بار نہیں لائے گی تو انہوں نے حیات مستعار کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دوسری شادی رچالی تھی۔ پھر شادی الذکر بھی کئی موسموں تک ٹنڈ منڈ رہی تو وہ اسے بھی پس پشت پھینک کر تیسری رفیق سفر لے آئے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ شریک حیات سوم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے فرض منصبی نبھانا شروع کیا تو منشی صاحب کی پہلی ازواج بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئیں اور سوتن کے مقابلہ پر بچوں کو جنم دینے لگیں۔

اب یہ ہوتا کہ منشی صاحب کی پہلی بیویاں مثل صیاد گھات لگا کے بیٹھ جاتیں اور جونہی دیکھتیں کہ ان کی سوتن کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے وہ بھی جھٹ بھاری ہونے لگتیں اس طرح سے چند ہی برسوں کے اندر منشی صاحب کی بیویوں نے ضدم ضدی کئی کئی بچے پیدا کر دیئے۔ جن کے باعث منشی صاحب کا گھر کبوتروں کا ڈربہ معلوم ہونے لگا۔

ان کی یہ مخاصمت و مسابقت جب جنون کی حد کو چھونے لگی تو منشی فاضل ایک روز پھٹ پڑے اور ڈنڈا اٹھا کر پہلی دو بیویوں کے گرد ہو گئے۔

"مکارو' دغابازو۔ کہاں تو پہلے قوم کا قیمتی وقت محض مکھیاں مار کر ضائع کر رہی تھیں کہاں اب ناغہ ہی نہیں کر رہیں۔" انہوں نے بیویوں کے سرین کو ڈنڈے کا مزہ چکھا کر کہا۔ "خبردار آئندہ اگر تم تینوں میں سے کسی نے آواز بھی پیدا کی۔ مجھے نہیں چاہیے اولاد شولاد' بھاڑ میں جائے وہ سونا جس سے کان پھٹیں۔"

اولاد کی کثرت اور دائمی عسرت نے منشی صاحب کی صحت و شخصیت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ مسکرانا موقوف کر چکے تھے اور بات بات پر یا آہیں بھرتے تھے یا مغلظات بکتے تھے۔ رہی سہی کسر ان کے پہلوٹھی کے پسر نے نکال دی تھی۔ خلف الرشید کا نکاح مسنونہ ہوئے گیارہ برس بیت گئے تھے مگر اس نے منشی صاحب کی نسل کو آگے بڑھانا تو درکنار اہلیہ کی جانب ہاتھ تک نہیں بڑھایا تھا۔ اس کی

ماں روزانہ صبح بہو سے بہت اشتیاق کے ساتھ پوچھتی تھی۔

"دلہن بیٹا۔ پانی گرم کر دوں۔ نہاؤ گی۔"

تو بے زار اور بھنائی ہوئی دلہن بھاڑ سا بدن کھول کر زہر خند سے جواب دیتی۔

"آپ نہائیں۔ میں نہا کر آ رہی ہوں۔"

منشی صاحب نے متعدد بار محتاط جگر گوشے کو گھر کے الگ تھلگ گوشے میں لے جا کر اولاد کی اہمیت سے آگاہ کیا تھا' کہ اولاد میٹھا میوہ ہوتی ہے اسے ضرور چکھنا چاہیے۔ پر نور چشمی ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک ہی جواب تھا کہ اولاد کے نام پر اس گھر میں جو کچھ ہوا ہے اس اعتبار سے یہ گھر آئندہ دو نسلوں تک مزید بچوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک روز منشی صاحب نے پینترا بدل کر بیٹے پر حملہ کیا۔ اور اسے ڈرانے کے لیے آواز کو تشویش ناک بنا کر بولے۔

"برخوردار۔ پوتے پوتی کے لیے میں تمہیں پریشان نہیں کرتا لیکن ایک تنبیہہ میری پلے باندھ لے کہ شوہر اگر بیوی کے چیختے دھاڑتے جذبات پر جان بوجھ کر کان نہ دھرے۔ تو وہ بامر مجبوری گناہ کی واہیات وادی میں قدم دھر دیتی ہے۔ اس لیے تو بھی گھر آئی لکشمی کو بے شک کھلا پھرنے دے لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی پکڑ لے۔"

منشی صاحب کا یہ حربہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ ان کے بیٹے کی سرد مہری پر خراش تک نہ آئی جس پر منشی صاحب کا دل دنیائے آب و گل سے بالکل اچاٹ ہو گیا وہ لوطی اور قنوطی شعرا کے کلام بلاغت نظام میں کھو کر رہ گئے۔ جن دنوں ہم ان سے پڑھتے تھے ان دنوں ان کے اعصاب پر سے میر تقی میر اتر چکے تھے اور میر درد مسلط تھے۔ میر درد کی اس غزل:

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
کس لیے آئے تھے کیا کر چلے

کی قریباً مہینہ بھر پیٹ بھر کے تشریح و توضیح کرنے کے بعد ایک دن انہوں

نے تنخواہ کا حساب لگانے کے لیے اچانک ہم سے پوچھا۔

"آج کیا تاریخ ہے؟"

فٹ بال ٹیم کا گول کیپر غلام نبی جواب میں دانت کچکچا کر بولا:

"منشی جی آج میر درد کی اٹھائیسویں ہے۔"

ترقی پسند شعرا کو وہ شاعر کی بجائے غنڈے تصور کرتے تھے۔ کسی ترقی پسند شاعر کا کلام "اتفاقاً" قریب آجاتا تو ناک پر رومال رکھ لیتے تھے۔ فرماتے تھے اردو شاعری کی دلگداز پاکیزگی اور جان گداز طہارت کو جس وحشیانہ انداز میں ترقی پسند شاعروں نے تار تار کیا ہے اس طرح کی درندگی انگریزوں نے بھی ہندوستانیوں کے کلچر کے ساتھ روا نہیں رکھی تھی۔ مثال دینے کی خاطر یا ہمارے پر زور اصرار پر اگر انہیں کوئی شعر سنانا پڑتا تھا تو دیدہ دانستہ اس کا روپ بگاڑ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے قتیل شفائی کا شعر ہمیں اس طور سے سنایا:

جب بھی آتا ہے مرا لام ترے لام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے لام سے جل جاتے ہیں

انہوں نے ترقی پسند شعرا سے ہمیں بدظن کرنے کے واسطے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ مگر وہ اپنے نیک مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم انہیں چڑانے کے لیے ترقی پسند شعرا کے شعر زیادہ یاد کرتے تھے اور جمعرات کے جمعرات جو بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تھا اس میں انہیں بروئے کار لاتے تھے۔ قتیل شفائی کے اشعار دوسرے ترقی پسند شعرا کی نسبت ہمیں زیادہ ازبر تھے کیونکہ رسالوں کے "میرا پسندیدہ شعر" والے کالم میں انہی کے اشعار کثرت سے شائع ہوتے تھے۔

غنائیت سے لبریز شعر کہنے والے صف اول کے شاعر قتیل شفائی سے میرا وہ دیرینہ ربط و تعلق آج بھی قائم ہے۔ آج بھی جب کہ میرا حافظہ اس قدر نحیف و نزار ہو چکا ہے کہ مجھے بچوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ قتیل صاحب کا شعر دیکھتا ہوں تو فوراً یاد کر لیتا ہوں۔ یوں میرے حافظے میں ان کے اشعار کا انبار لگا ہوا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے میں نے اپنے بچوں کو ایک رحم دل ڈاکو کی سبق آموز

کہانی سنا کر قتیل صاحب کا یہ شعر پڑھا:

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

قتیل شفائی کے شعروں میں ترنم حد سے بڑھ کر ہوتا ہے اگر کوئی انہیں تحت اللفظ میں پڑھنا بھی چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔ کسی نہ کسی لفظ کو ادا کرتے وقت، قاری کے گلے میں گھنٹی ضرور بج اٹھے گی۔ یہ نغمگی صرف شعروں تک ہی محدود نہیں ہے۔ قتیل صاحب آپ بھی سر سے پاؤں تک سارے گاماپا ہیں۔ ان جیسا خلیق اور ملائم شخص میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ جو ایک مرتبہ ان کے مدار میں داخل ہو جائے وہ پھر انہی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ میں بھی برسہا برس سے ان کا طواف و تعاقب کر رہا ہوں۔ یہ کتاب میری اسی الفت اور عقیدت کا مظہر ہے۔ اس میں میں نے وہ مضامین زیادہ تعداد میں پیش کئے ہیں جن میں قتیل صاحب کے بے تکلف دوستوں نے ان کی شاداب و شیریں شخصیت کے مخفی پہلو متعارف کرائے ہیں۔ جن مضامین میں ان کے فن کا احاطہ کیا گیا ہے وہ کم رکھے ہیں کیونکہ راگنی کو خوشبو کو رنگ کو کسی زیور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قتیل صاحب واحد شاعر ہیں جن کی شہرت و مقبولیت کے سورج پر نصف صدی بیت جانے کے باوجود اضمحلال طاری نہیں ہوا۔ وہ ہنوز روز اول کی مانند درخشاں و تاباں ہے۔ گو نابینا ناقدوں نے ہمیشہ انہیں نظر انداز کیا ہے اور اردو شاعری میں ان کا جو مقام بنتا ہے وہ انہیں دینے سے منافقانہ اغماض برتا ہے لیکن اس کا قتیل صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ سخن فہم حلقوں میں وہ بیسویں صدی کے بڑے شعرا تسلیم کئے جاتے ہیں اور سب کا ایمان ہے، کہ ان کا کلام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اردو زبان زندہ رہے گی۔ وہ مسلسل شعر کہہ رہے ہیں اور باری تعالیٰ سے میری دلی دعا ہے کہ:

یوں تو لکھتا ہی رہتا ہے نظمیں غزلیں گیت قتیل
اسے کوئی ن تخلیق ہمیشہ زندہ رہنے والی دے

آخر پر عرض کردوں کہ کتاب میں پروف کی کچھ نہ کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں گی۔ براہ کرم انہیں درست کر لیجئے گا۔ مشینی چوزوں کی مانند مشینی کتابت میں بھی صرف نمائشی حسن ہوتا ہے اس لیے غلطی کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

ضیا ساجد
اکتوبر انیس سو چورانوے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

قتیل شفائی کی شاعری پر ایک نظر

کچھ مدت کی بات ہے میں نے ’’فن اور شخصیت‘‘ بمبئی کے قتیل شفائی نمبر کے لئے قتیل شفائی کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس وقت یہ مضمون میرے سامنے تو نہیں ہے لیکن مجھے یاد ہے کہ اس میں قتیل کی شاعری کا ذکر نہیں تھا۔ ہاں رموز شعر میں قتیل شفائی کو جو گہری نگاہ حاصل ہے اس کی مثالیں میں نے دی تھیں اور وہ بھی بر سبیل تذکرہ۔

اس وقت مجھے یاد بھی نہیں کہ وہ مثالیں کون کون سی تھیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ان مثالوں کے پس پردہ قتیل کی وہ شخصیت جھلک رہی ہے جس کی تشکیل قدیم اور جدید کے امتزاج سے ہوئی ہے۔ یہاں قدیم اور جدید سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ قتیل قدامت پرست ہے یا جدت پرست بلکہ میں کہہ رہا ہوں کہ قتیل کی شخصیت میں وہ میانہ روی اور یہ توازن ہے جو دیروز کے احترام اور فردا کے استقبال کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور یہ توازن اس کی شاعری کا انمول سرمایہ ہے۔

یہاں میں ٹی ایس ایلیٹ کے اس مقولے کی تردید نہیں کر رہا ہوں کہ شاعری شخصیت کے اظہار کا نہیں اس کے اخفاء کا ایک وسیلہ ہے، بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ شخصیت کا اظہار اور شخصیت کا اخفاء اسی طرح ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں، جس طرح فراق اور وصال ایک ہی جذبے کی دو کیفیتیں ہیں۔ ان دونوں میں تضاد نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں ایک بغیر دوسری

نا مکمل ہے۔

قتیل کی شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ محمد طفیل مدیر "نقوش" لاہور قتیل کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "غزل اور گیت ان کا خاص میدان ہے۔ ان دو شعری میلانوں کے علاوہ ان کی دھاک ایک اور فیلڈ میں بھی ہے اور وہ ہے فلمی شاعری جسے انہوں نے ادبی شاعری کے قریب تر کر دیا ہے۔" قتیل کی غزل گیت اور فلمی شاعری کے بارے میں جو کچھ محمد طفیل نے لکھا ہے اس سے اتفاق کرنے کے باوجود مجھے حیرت یہ ہے کہ طفیل ایسے مستند اہل قلم نے قتیل کی نظم کو کیونکر نظر انداز کر دیا۔

میں نے ایک آدھ سطر اوپر یہ لکھا ہے کہ قتیل کی شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ لیکن ان دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل واقع نہیں ہے۔ رلکے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعر جب ایک درخت کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک درخت اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ رلکے نے یہ مثال قدرے کرخت لفظوں میں دی ہے لیکن اس کی صداقت میں شک نہیں کیونکہ رلکے کہنا یہ چاہتا ہے کہ بیرونی یا خارجی عوامل جب تک شاعر کے دل میں اتر کر اس کے وجدان میں رچ بس نہیں جاتے شاعر انہیں کامیابی کے ساتھ شعری تجربے میں نہیں ڈھال سکتا۔ یہاں میں اپنے ایک ذاتی تجربے کی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ بے محل نہیں ہے لیکن بہت با محل بھی نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آج سے تیس برس قبل جب اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" سے بے اندازہ طور پر متاثر ہو کر میں یہ دیکھنے کے لئے قرطبہ (ہسپانیہ) پہنچا کہ ذرا اس Bach_Drop کو تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں جس نے اردو شاعری کو اتنی بڑی نظم دی ہے، تو اس مسجد کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اقبال کی نظم اس مسجد کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ اس مسجد کے بارے میں ہے جو اقبال کی آنکھوں کے رستے اس کے دل میں اتری اور اس کے وجدان میں رچ بس جانے کے بعد جب صفحہ قرطاس پر نمودار ہوئی تو یہ وہ نظم تھی جو ہم "بال جبریل" میں دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک رلکے کی مذکورہ بالا تحریر میری نظر سے نہیں گزری تھی اور جب ایک مدت کے بعد میں نے رلکے کی مذکورہ بالا تحریر دیکھی تو مجھے نا قابل بیان دلی مسرت ہوئی کہ اپنے

ہم زبانوں میں نہ سہی باہر کے لوگوں میں اپنا ایک ہمنوا تو ملا۔

تو خیر' بات قتیل شفائی کی ہو رہی تھی اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ قتیل کی نظموں کے خارجی محرکات اس کے وجدان کا جزو بن کر اس طرح اس کی نظموں کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں کہ اس میں خارجی محرکات اور داخلی محرکات کی حد بندیوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔

یہی سبب ہے کہ قتیل کی نظمیں تغزل کی کیفیت سے لبریز ہیں' جو اس غزل کی خاصیت ہے کیونکہ تغزل صرف روح غزل ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ساری روح شعریت کا نام ہے۔ اس تعریف میں صرف غزلیہ شاعری ہی نہیں بلکہ شاعری کی تمام اصناف آ جاتی ہیں۔ غزل کی آپ نے کئی تعریفیں سنی ہوں گی' لیکن دیکھئے غزل کو قتیل کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

سخن بریدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لئے اب غزل ہی باقی ہے

لیکن یہ وضاحت وہ وضاحت نہیں جسے ہمارے پیشہ ور نقادوں نے اپنی جاگیر بنا رکھا ہے۔ جن میں اکثر تو ایسے ہیں جو مصرع موزوں نہیں پڑھ سکتے لیکن شعر پر تنقید فرمانا اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ یہ وضاحت ایک سچے اور کھرے شاعر کی وضاحت ہے اور شاعری کی زبان میں۔ اور شاعری کی زبان بھی ایسی جو اس کی اپنی شاعری کی زبان ہے۔ اپنی شاعری کی زبان کے الفاظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک شاعری بیان کا تجربہ نہیں ہے بلکہ تجربے کا بیان ہے۔ یہی تجربے کا بیان قتیل کی غزل میں آ کر یہ رنگ اختیار کرتا ہے۔

سب کہتے ہیں اک جنت اتری ہے میری دھرتی پر
میں دل میں سوچوں شاید کمزور مری بینائی ہے
آج ہوا معلوم مجھے اس شہر کے چند سیانوں سے
اپنی راہ بدلتے رہنا سب سے بڑی دانائی ہے
انعام کے لالچ میں لکھے مدح کسی کی

اتنا تو کبھی کوئی سخن ور نہیں گرتا
اس بندۂ خوددار پہ نبیوں کا ہے سایا
جو بھوک میں بھی لقمۂ تر پر نہیں گرتا

کمال یہ ہے کہ دشمن پہ جو چلانا تھا
وہ تیر اپنے کلیجے پہ کھا لیا میں نے

پتھر اسے نہ جان پگھلتا بھی دیکھ اسے
خود اپنے تجربات میں ڈھلتا بھی دیکھ اسے

یار کیوں گریزاں ہے سیدھی راہ چلنے سے
منزلیں نہیں ملتیں راستے بدلنے سے

جب وہ بچ نکلے تو پانی میں مجھے پھینک دیا
کود کر میں نے جو دریا میں بچائے کچھ لوگ

مردوں کو زندہ جو کرے اس پر آئے ہیں
ہر دور میں عیسیٰ کو ہم مصلوب کرتے آئے ہیں

یہ اشعار تشبیہ' استعارہ اور علامت کے حسن سے مملو ہیں ان میں دلکشی بھی ہے تازگی بھی' خلوص و صداقت بھی اور سماجی شعور بھی اور ہر شعر میں فکری عناصر کا وہ سلسلہ بھی موجود ہے جو ہر شعر کے مذکورہ محاسن کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر رہا ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر شاعر کا کمال فن یہ ہے کہ ان تمام اشعار میں خیال خود جذبہ بن گیا ہے' فکر' فکر محسوس بن گیا ہے- Feet Thought بن گیا ہے اور اس خوبصورتی سے کہ خیال اور جذبے کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہے

جہاں تک قتیل کی نظموں کا تعلق ہے یہ نظمیں ہماری شاعری میں تنوع موضوعات کی ایک خوبصورت مثال ہیں- تنوع موضوعات سے میری مراد وہ تنوع موضوعات نہیں جو قلی قطب شاہ' نظیر اکبر آبادی تلوک چند محروم' جوش ملیح آبادی اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں ہمیں نظر آتا ہے بلکہ وہ تنوع موضوعات ہے جو محدود موضوعات سے پھوٹ کر جلوۂ صد رنگ کی تصویر بنتا ہے-

قتیل کی شاعری کا ایک موضوع طوائف ہے۔ اس موضوع کی حدیں ایک طرف جنسی شاعری سے جا کر ملتی ہیں' تو دوسری جانب معاشرے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے۔ ان نظموں کے بارے میں جن میں سے چند ایک کے عنوان ہیں۔ عمر پرستی' چکلے' نائیکہ' تماش بین' ٹریجڈی' معصوم' اندیشہ' ہماری شاعری میں اس تجربے کا ایک فن کارانہ بیان ہیں جو ہمارا سماج ایک مدت سے دیکھتا آ رہا ہے' لیکن جس پر ایک فنکار کی بھرپور نگاہ پہلی بار پڑی ہے۔ میں اس مضمون میں شاید اس سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکا ہوں کہ شاعری بیان کا تجربہ نہیں ہے بلکہ تجربے کا بیان ہے اور جس شاعری کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایک حساس شاعر کے تجربے کا فن سے لبریز بیان ہے۔
یہ نظمیں ہمارے معاشرے کی محض جنسی بے راہ روی کی تصویریں نہیں ہیں بلکہ ایک درد بھرے دل کی آواز ہیں۔ اس شاعری کو اس جنسی شاعری کے ساتھ خلط ملط بھی نہیں کیا جا سکتا' جو حسرت موہانی کے یہاں ملتی ہے یا جرات کے یہاں یا فراق کے یہاں۔ اس شاعری کو معاشرے کی بے راہ روی پر محض طنز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نظمیں وعظ و نصیحت کے انبار بھی نہیں ہیں' اور شاعری یا فن چونکہ بذات خود ایک Value ہے' ایک قدر ہے اس لئے شاعری میں ڈھلے ہوئے عبرت کے یہ الفاظ ہمارے ادب کے نادر نمونے ہیں۔ شاعر کو اس حقیقت کا احساس ہے چنانچہ اپنے ایک مجموعہ کلام ''مطربہ'' کے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ بڑے بڑے انشاء پرداز طوائف کے بارے میں لکھ لکھ کر ہار گئے پھر بھی یہ جنس بازار میں موجود رہی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک کوئی نیا معاشی نظام نہیں آ جاتا تب تک نغموں کی اوٹ میں جسم بکتے ہی رہیں گے۔ اس کے باوجود میں اپنی یہ نظمیں پیش کر رہا ہوں۔ اصلاح معاشرہ کی غرض سے نہیں بلکہ اچھے ادب کے طور پر۔

ان دو ایک جملوں میں شاعر نے اپنا نظریہء شعر یا نظریہء ادب صرف خوبصورتی سے بیان ہی نہیں کر دیا بلکہ اپنے قاری پر یہ نکتہ بھی فاش کیا ہے کہ میری شاعری میں مقصدیت کی ایک موج زیریں تو موجود ہے لیکن یہ میرے فن پر حاوی نہیں ہو سکی ہے بلکہ یہاں فن مقصدیت پر حاوی ہے یا دوسرے لفظوں میں مقصد خود فن بن

گیا ہے۔ اس نظریئے کو قتیل نے اپنی شاعری میں جس طرح برتا ہے وہ ایک سنجیدہ قاری کو قتیل کی شاعری کے متعدد پہلوؤں میں نظر آئے گا۔ خواہ اس شاعری کا پس منظر وطنی ہے یا سماجی یا قومی ہے یا بین الاقوامی یا روحانی یا شعوری یا تحت الشعوری۔

میں نے اپنی اس تحریر میں قتیل کی شاعری کے بعض محاسن مثلاً" تشبیہ، استعارے اور علامت کا حسن، حسن بیان کی سادگی، خلوص اور صداقت، سماجی شعور، روانی اور سہل ممتنع کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کی ایک اور شعری خصوصیت کا ذکر نہیں کیا ہے اور اسی کے ذکر پر میں اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

اس شعری خصوصیت کا تعلق رموز شعر سے ہے اور قتیل کے اس رجحان طبع کا تھوڑا سا ذکر میں اس مضمون میں کر چکا ہوں جو میں نے قتیل کی شخصیت پر لکھا تھا۔

اگرچہ نظم آزاد، نظم معرا اور آزاد غزل کا تجربہ ہماری شاعری میں ایک مدت سے ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن قتیل کے یہاں بعض اور تجربے بھی کمال فن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ مثلاً" کم مروج بحروں کا استعمال۔ غالب کی ایک غزل ہے۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

میں اس بحر کے نام سے نا آشنا ہوں اور اس کے زحافات سے بھی اور اس بحر کے ان زحافات سے بھی جو غالب کی اس غزل میں آئے ہیں۔ اور جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں نے اس زحاف میں صرف دو یا تین شعراء کی ایک ایک غزل دیکھی ہے۔ ان میں سے ایک سیماب اکبر آبادی ہیں اور دوسرے پنڈت میلا رام وفا۔ تیسرے کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بڑے شعراء میں غالب، اقبال، انیس یا ان کے بعد جوش اور فراق کا کلام اس بحر اور اس زحاف سے خالی ہے اور مجھے اس وقت یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ اس شاعر کے یہاں جسے میں نے متنوع العباد کا شاعر کہا ہے، اس بحر اور اس زحاف میں غزل موجود ہے۔

حسن اگر میرا احتساب کرے گا
اپنی اداؤں کو بے نقاب کرے گا

میں یہاں یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں کہ شاید میرے اور قتیل کے " ایج گروپ" یا ہمارے بعد آنے والی نسل میں اردو کے کسی شاعر نے اس بحر کو استعمال کرنے کا تجربہ نہیں کیا ہو گا بلکہ ایک مثبت انداز کی بات کہنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ قتیل کی تنوع پسند شاعرانہ طبیعت نے انہیں ان بحروں کی طرف راغب کیا جو ہمارے دور تک آتے آتے متروکات میں شامل ہو چکی تھیں۔ اگرچہ ان کی موسیقیت میں نہ کوئی شبہ تھا نہ ہے۔ اسی طرح قتیل کے مجموعہ کلام "پیراہن" میں ایک غزل ہے۔

بات چھیڑ اس کے حسن جمیل کی
پھر دعا مانگ عمر طویل کی

یہ پنجابی کی ایک بحر ہے اور "ڈاچی والیا موڑ مہار وے" اس بحر میں ایک مشہور گیت ہے۔ اس بحر میں حفیظ جالندھری کی مندرجہ ذیل نظم کے علاوہ اپنے محدود مطالعے کے پیش نظر میں نے کسی اور اردو شاعر کا کلام نہیں دیکھا۔

جی نڈھال ہے فرقت یار میں
مجھے لے چلو اے میرے دوستو! نہ نشاط میں نہ شالامار میں
جی نڈھال ہے فرقت یار میں

اس طرح کے شعری کارنامے محض متشنیات سمجھ کر نظر انداز نہیں کیے جا سکتے بلکہ یہ شاعر کی جودت طبع کی دلیل کے طور پر اردو شاعری میں ایک مستحکم اور پائیدار مرتبے کے حامل ہیں۔

اسی "پیراہن" میں ایک غزل رباعی کی بحر میں ہے۔ رباعی کی بحر میں غزل یا نظم کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ رباعی نکلی تو ہے "ہزج مثمن سالم" نامی بحر سے لیکن اس کے زحافات کی تعداد کم از کم چوبیس اور زیادہ سے زیادہ اسی ہزار مانی گئی ہے۔ یہ شاداں بلگرامی مرحوم فرما گئے ہیں' یہ خاکسار محض انہیں دہرا رہا ہے۔ خیر

چھوڑیئے اس بحث کو۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے رباعی گو شاعروں میں سے مجھے صرف محروم کے یہاں دو نظمیں رباعی کے زحاف میں نظر آئی ہیں۔ ایک ان کے مجموعہ کلام "گنج معانی" میں ہے اور ایک ان کے ابتدائی مجموعے "کلام محروم" (حصہ سوم) میں پیش لفظ کے طور پر درج ہے۔ ان دو نظموں کے علاوہ میں نے رباعی کے زحاف میں غزل صرف قتیل شفائی کے یہاں دیکھی ہے۔

وہ شخص برا تھا نہ وہ ہرجائی تھا
اس کو فقط اندیشہء رسوائی تھا

میں اپنے مطالعے کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ میرا مطالعہ محدود ہے اور ہو سکتا ہے کہ قتیل سے پہلے محروم کے علاوہ کسی اور شاعر نے بھی رباعی کے زحاف میں نظم یا غزل کہی ہو لیکن اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ ایسے شعراء کی تعداد بھی دو ایک سے زیادہ نہیں ہو گی اور رباعی کے زحاف میں ان کی غزلوں یا نظموں کی تعداد بھی دو ایک سے زیادہ نہیں ہو گی۔

اب آخر میں شاعری کی ایک اور صنف، اس کا ذکر کر کے اپنی اس بات چیت کو ختم کرتا ہوں۔ اور وہ صنف ہے خماسی جو قتیل کی ایجاد ہے قتیل کی خماسیاں غالباً" ان کے کلام کے مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ غالباً" کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ بھوپال اور دہلی کے اس سفر میں جب میں یہ مقالہ لکھ رہا ہوں تو میرے سامنے قتیل کے تمام مجموعہ ہائے کلام نہیں ہیں۔ صرف پانچ مجموعے ہیں' جل ترنگ، گجر، آموختہ' مطربہ اور پیراہن۔ اور قتیل کے شعری مجموعوں کی تعداد غالباً" پندرہ یا سولہ ہے۔ ہو سکتا ہے کسی مجموعے میں خماسیاں ہوں بھی لیکن میں نے ان کی خماسیاں پاکستان کے ادبی جرائد میں پڑھی ہیں۔ ان کے بارے میں مجھے یہی کہنا ہے کہ قتیل کی خماسیاں اردو کے شعری ادب میں ایک حسین اور باوقار اضافہ ہے۔

دراصل اپنی اس تحریر کا اختتام قتیل کے گیتوں اور ان نظموں پر کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا عنوان "دعا" ہے۔ یہ دونوں قتیل کی شاعری کے اہم پہلو ہیں' لیکن فی الحال میں ان پر بات چیت شروع نہیں کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ اس وقت مسلسل سفر میں ہونے کی وجہ سے میں اس مضمون کو اس وقت تک قسطوں ہی کی صورت میں لکھ

سکا ہوں۔ اس مضمون کی ابتداء جموں میں ہوئی' وہاں سے میں بھوپال گیا اور بھوپال سے دہلی۔ دہلی سے میں پھر جموں آیا۔ کہیں طیارے میں اور کہیں ریل میں یہ مضمون سطر بہ سطر آگے بڑھتا رہا۔ اب میں پھر دہلی اور وہاں سے دوحہ (قطر) کے لیے پابہ رکاب ہوں۔ اگر قتیل کے گیت پر اور ان نظموں پر جن کا عنوان دعا ہے' لکھنا شروع کرتا ہوں تو اندیشہ ہے شاید اس مقالے کی تکمیل میں اتنی تاخیر ہو جائے کہ یہ منتظمین جشن قتیل کے ہاتھوں میں وقت پر نہ پہنچ سکے۔ اس لئے قتیل اور سلیم جعفری کو یہ شعر پیش کرتے ہوئے میں اس مقالے کی تکمیل کے کام کو عارضی طور پر ملتوی کرتا ہوں۔

ے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بہ توصد حساب باقیست

ساحل احمد
(بھارت)

قتیل شفائی کا غزلیہ آہنگ

اوائل بیسویں صدی میں اردو شاعری کی پوری تاریخ آزادی کی جدوجہد، اتحاد و یکجہتی، سیاسی و سماجی شعور، اخلاقی قدروں، وطنیت کے اعلیٰ تصور سے بھری ہوئی ہے۔ اس نے ہر مقام اور ہر جگہ قومی مسائل اور اس کی ضرورتوں کا پاس کیا ہے اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل نے شعر و ادب کے افادی پہلوؤں کو اجاگر کیا اور نئے شعری تجربات سے ہیئت و ماہیت اور فکر کے اجتہادی چراغ جلائے اس نے نہ صرف ملک کے سیاسی و معاشی اور قومی معاملات و مسائل میں دلچسپی لی اور ادب و سماج کے باہمی رشتوں کو مضبوط کیا اور ایسی شاعری کی بنیاد رکھی جو افتراق و انتشار اور علیحدگی پسند رجحانات کو شکست دے سکے۔ انسانیت اور ملک سے محبت کرنا سکھائے، امید و یقین کے نغمات سے بے حسی اور بے ضمیری کو ختم کرنے کی ضرورت محسوس کرے اور اپنی شاعری جو زندگی کو زندگی اور موت کو موت سمجھنے کی صلاحیتوں سے آشنا گیر کرے۔

جب ہندوستان کی تقسیم کے بعد دسمبر 1947ء کے آخری ہفتے میں ترقی پسند ادیبوں کی لکھنؤ کانفرنس کے بعد مئی 1949ء میں بھیمڑی کانفرنس نے ایک نیا مینی فیسٹو تیار کیا۔ جس میں نئے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی معاملات میں ترقی پسند ادیبوں کو مل کر ترقی پذیر قوموں کا ساتھ دینے پر زور دیا گیا۔ مگر اس منشور نے خود ترقی پسندوں

میں کئی گروہ قائم کر دیئے اور برہمی و بیزاری کی فضا پیدا ہوئی لیکن تعطل کی یہ فضا تا دیر قائم نہیں رہی۔ 1953ء کے نئے منشور کی رو سے ''ادب کو فنی اعتبار سے خوبصورت ہونا چاہئے، قومی اور عوام پسند ہونا چاہئے۔'' چنانچہ آزادی کے بعد ان میں وہ شعراء بھی شامل ہیں جو آزادی سے پہلے ہی مشہور ہو چکے تھے، لیکن ان کی شعری کاوشوں میں نئی جلا، نئی قوت، اور نئی شان آزادی کے بعد پیدا ہوئی۔ جن میں ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، سلیمان ادیب، ابن انشا اور مصطفےٰ زیدی وغیرہ نے شہرت و مقبولیت کے ساتھ نئی شعری جہتیں تلاش کیں، فکرو جذبہ کے امتزاج سے نئے نئے رنگوں کی وضع کاری کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے اردگرد کے تمام کڑوے، کسیلے، واقعات کی تصویریں اتاریں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں نفرت و تشدد کے بڑھتے ہوئے خونی سیلاب پر روک لگانے کی سعی کی اور شاعری کا ایک ایسا طاہرو فاخر ذخیرہ فراہم ہوا جو اردو شعرو ادب کے لئے طرہ امتیاز بنا۔ نظموں کی طرح غزلوں میں بھی یہی پاکیزہ اور طاہرہ صفات موجود ہیں۔

غزل ان گو ناگوں روایات اور قدروں کے باعث دوسری صنفوں سے علاوہ نظر آتی ہے اور اپنے متنوع تجربات کی بنا پر ممتاز، مطہر حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کی اس حیثیت کو قائم و دائم رکھنے میں غزل گوئیوں نے قلمی جہاد سے کام لیا ہے۔ یگانہ و فراق کی غزل میں فکری و نظری اصول کے مطابق حذف و اضافہ کی کافی گنجائش رہی ہے اور پھر غزل فیض و مخدوم اور قتیل و مجروح تک پہنچی تو اس کی نگری میں خاصہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ترقی پسند فکر کے تربیت یافتہ نئے شعراء نے بھی سیاسی اور تمدنی مسائل کی ترجمانی کے نت نئے زاویئے تلاش کئے، وہی بیسویں صدی کی فکری و نظری عمارت کی سنگ بنیاد بنے۔ قومی و ملی مسائل کی پیش رفت کے نتیجے میں ہی معاشی مسئلوں کو بھی غزل کا موضوع بننے میں آسانی ہوئی، جنھوں نے غزل میں مادی تصور کو فروغ دیا اور غزل کو بالکل ایک نیا ذائقہ دیا۔ کچھ نظم گوئیوں نے غزل کو نظمی لبادہ پہنانے کی کوشش کی، مگر ان کی یہ کوشش جوش کی غزل کی طرح ناکام ثابت ہوئی۔ نا نظموں کی طرح بعض غزل گوئیوں نے بھی اسے نظمانے کی کوشش کی اور غزل کے موضوعی منطقے میں داخل ہو کر اس کے اس مخصوص خدو خال کو بدلنے کی سعی کی

جس کو ولی، میر، غالب، آتش اور یگانہ جیسے آہن شکن شعراء نے مضبوط و پختہ کر دیا تھا۔ غزل کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے اور جو شعراء غزل کے اس مزاج سے آشنا تھے، انہوں نے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا وسیلہء اظہار بنانے میں کامیابی حاصل کی اور غزلیت کی فضا کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں نئی جاذبیت اور نئی لطافت پیدا کی۔ منظری اور اشاریاتی زبان میں حیات و کائنات کے پردہ ہائے خفتہ کی عقدہ کشائی کی گئی۔ یوں ابھی تک داغ و امیراور جلال کے اثرات باقی ہیں لیکن نئے شعراء کی آتشانہ فکر غزلی منطقے کو وسیع کرتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں روایت اور تجربے کی ہم آہنگی بھی ہے اور سماجی و سیاسی فکرو انقلاب کی مصوری بھی۔!

چنانچہ قتیل شفائی نے غزل کے اس منفرد اسلوب و مزاج کی حفاظت کی اور اپنی غزلوں میں حیات و کائنات اور فکرو نظر کی تمام فنی و اسلوبی نزاکتوں کو ملحوظ رکھا۔ انہوں نے غزلیہ روایت کی نفی نہیں کی اور نہ فکری لمحات میں عاشقانہ گداختگی سے گریز کیا۔ غزل کی روایتی فکر اور لوازمات شعری کے برتاوے کا بہ طور خاص خیال رکھا۔ عصری تقاضوں کو فنی گداختگی سے آشنا کیا۔ ان کے کلام کا اصل رنگ عشق سے ہی مستعار ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غزل اس اکیلے رنگ سے نہیں رنگی، بلکہ زندگی سے کشید تجربات کو بھی اپنی غزل کا جزو خاص بناتے ہوئے کئی اور رنگوں کی اختراع کی ہے۔ ان کی یہ اختراع سازی کلام کی معنوی تہہ داری کو اور بھی زیادہ وقیع بنا دیتی ہے۔ ان کا کلام متنوع مضامین سے سرسبز ہے:

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی!
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

تصور ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید
دل ان کو ڈھونڈ کر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا انکو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اک ذرا سا دل ہے جسکو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں' چاندی کی دیوار نہیں

صدمے جھیلوں' جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفاکا' کوئی بھی معیار نہیں ہے

ہم ان کی آنکھوں سے دنیا دیکھ رہے ہیں ورنہ
ایک ایک جھروکہ ان کا ہے' ایک ایک نظارہ ان کا

کسی میں تیرے خدو خال کا جمال نہ تھا
بنا بنا کے مٹاتا رہا ہوں تصویریں

کون ہے نغمات خراماں' کس پہ چلے رفتار کا جادو
عشق تو ہے پابند سلاسل ۰ اے غم جاناں اے غم دوراں

سر بام بھی پکارا لب دار بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا تری دید کی لگن میں

جھمکتے جھومتے موسم سے لے کر چاندنی شب تک
مری ایک ایک جنت یاد کرتی ہے تجھے اب تک

کیسے کیسے وہ ابھرتی ہیں بدن کی لہریں'
ڈگمگایا ہے نگاہوں کا سفینہ کیا کیا

ترا یوں خیال آیا مجھے غم کی دوپہر میں
کوئی جیسے اپنا آنچل مرے سر پہ تانتا ہے

جب بھی ہم بھٹکتے ہیں یاد کے اندھیرے میں
دفعتا" بدن تیرا جگمگانے لگتا ہے

کیا حسین آنچ ہے مگر قریب جائے کون
اس کے بدن کو چھو کے اپنی انگلیاں جلائے کون

انہوں نے اپنی غزل کی آراستگی میں جس حلیمی و بردباری کا ثبوت دیا ہے اس کے جلو میں غم و غصہ اور ترش روی بھی اپنا اثر ڈالتی رہی نتیجتا" ان کی غزل معرکہ کارزار میں ہی کھری اتری ہے۔ زندگی اور زمانہء موجود کی سیہ روش کے مقابل دامن شعری کو سپر بنا کر پیش کیا۔ اور اپنے منصب شعری کے وقار کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی کڑوی' کھردری اور کسیلی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کی۔ مگر عصری ضرورتوں کی وجہ سے شعری خصوصیت مضروب نہیں ہونے پائی۔ ان کا مستحکم قلم ہر محاذ پر وسیلہء اظہار بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس تربیت یافتہ قلم کو غزلیہ لذت سے آشنا گیر کرنے کی پوری سعی کی ہے۔

ترس گئی ہے زمیں بادلوں کی صورت کو
کسی ندی نے کوئی گیت گنگنایا یا نہیں!

بارش خون شہیداں سے وہ آئے گی بہار
ساری دھرتی ہمیں گل رنگ دکھائی دے گی

بن گئے ثبوت آخر آپ اپنے جرموں کا
ہاتھ جو معطر تھے، پھول کو مسلنے سے

کر سکا ہے گدلا کون روشنی کے چشمے کو
چاند بجھ نہیں جاتا، آندھیوں کے چلنے سے

کبھی چہرے بدل کر بھی یہاں کچھ لوگ آتے ہیں
کبھی کچھ دیکھتی آنکھوں میں بینائی نہیں ہوتی

جہاں دو مسلکوں کے رہنما یکجا نظر آئیں
ہمیشہ اس جگہ اک گورکن موجود رہتا ہے

مجھ سے مفلس کا بھی جب حال کوئی پوچھتا ہے
میں یہ کہتا ہوں بڑا مجھ پر کرم ہے اس کا

مفلس کے بدن کو بھی ہے چادر کی ضرورت
اب کھل کے مزاروں پہ یہ اعلان کیا جائے

گل رنگ چراغوں کی لو سے تاریک اجالے پھوٹ بہے!
ہر طاق میں گھور اندھیرا ہے اس رنگ محل کو ڈھا ڈالو

روز و شب اپنے لئے ہیں قتل کے فتوے قتیل
مفتیء شہر اس قدر دیں دار پہلے تو نہ تھا

مجروح گلوں کا دامن میں پیوند لگے ہیں خوشبو کے
دیکھا جو بہاروں کا یہ چلن سنسان بنوں کی یاد آئی

سیاسی و تہذیبی رویے نے غزل کی نازکی اور طرح داری کو جس نئی جہت سے آشنا کیا' وہ جہت تو نگری کی اچھی مثال بنی۔ غزلیہ فکر میں ایجازی اور ایمائی زاویے اجاگر ہوئے' اپنی غزلوں میں دروں بینی کے اس رجحان کو سمونے اور بروئے کار لانے کے لئے فکر و معنی کے رشتے پر بہت زیادہ زور دیا ہے تاکہ وقت اور وقت سے جڑی تمام حقیقتیں غزل کا حصہ بن جائیں۔ لطیف انسانی جذبات و احساس کی مصوری کرتے ہوئے ان کے خدوخال کو حیات و کائنات کی منشاء و حقیقت کے مطابق رنگینی کی سعی کی ہے اور خارجی اشیاء کی تہذیب و تحسین کرنے میں جس شعری رویے کو ملحوظ رکھا ہے وہ واردات و تجربات کی گہری سی تہوں کو جگانے' نمو گیر کرنے اور برانگیختہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ انہوں نے زندگی کی اس بچی رمق اور تلاش و جستجو کی اس آگ کو مجلی رکھنے کی سعی کی ہے' جو زندگی کی پائداری اور اچھی دنیا کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ ان کی پوری شعری کائنات تگ و پے کے تانے بانے سے تیار ہوئی

ہے۔ انہوں نے اپنے اسی مضبوط و مخیر قلم کے ذریعہ زندگی کی ان سچائیوں کو اجاگر کیا جو ہمارے افعال و اعمال کو متحرک رکھنے اور موجل کرنے میں کارگر ثابت ہوں۔ انہوں نے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق پر مصلحت کی کوئی نقاب نہیں ڈالی اور نہ حقیقتوں کا ادراک کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔

ایک ایک کر کے اڑ گئیں پرچھائیاں تمام
اب صرف آہٹوں کی سچائی رہ گئی!

سو کے تو گنوا بیٹھا رتجگوں کی رعنائی
اب قتیل کیا حاصل، تیرے ہاتھ ملنے سے

سمندر پرسکوں ہے اس لئے گہرا بھی ہے ورنہ
مچلتی ندیوں میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی

چلا جائے وہ دنیا چھوڑ کر، سر پھوڑ کر اپنا
مگر تیشے کے دل میں کوہ کن موجود رہتا ہے

دشمنی یوں تو کسی سے بھی نہیں ہے میری
صرف حالات سے ہے جنگ و جدل تیرے لئے

غم ذات سے مری رندگی، غم کائنات میں ڈھل گئی
کسی بزم ناز میں کھو کے بھی، مجھے کائنات سے پیار ہے

سسک سسک کر صحن چمن میں ہر نغمہ دم توڑ رہا ہے
خوب ہوئی توقیر عنادل اے غم جاناں اے غم دوراں

میں نظام زر کی دیوی سے قتیل آشنا ہوں
کہیں نام اس کا سلمٰی کہیں چندر کانتا ہے

لاکھ بہاریں، لاکھ خزائیں، بات ہے موسم موسم کی
پھولوں کا سکھ پانے والے کانٹوں کا دکھ درد بھی جھیل

قتیل شفائی کے یہاں جذباتیت کی آنچ کچھ ضرورت سے زیادہ تیز ہے، لیکن شاعرانہ بے ساختگی اور تغزل کے پختہ عناصر نے انہیں منضبط رکھا ہے۔ ان کے یہاں جدید استعاروں کے ساتھ ہندی کے سبک و نرم لفظوں کا استعمال بھی تخلیقی سطح پر کیا گیا ہے جو غنائیت کا حسن مرکز رکھنے اور گیت پن کی کیفیت کو قائم رکھنے میں مانع ہوا، دراصل وہ ایک طرح سے تخیلی واقعیت کی پہچان ہے۔ یہی نہیں وہ عورت کی نفسیات سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ انہوں نے زندگی اور اپنے آس پاس کی گزرتی ہوئی روز مرہ کی زندگی کی تمام خوبصورتی اور بدصورتی کی منہ بولتی تصویریں اتاری ہیں جن میں نہ صرف جمالیاتی احساس اور احساس نفس کی وقیع تعبیریں ہیں، بلکہ تہذیبی و تمدنی فکر و نظر کے نقطہ شناس خطوط بھی۔ لیکن قتیل کی یہی جذباتیت اجتماعی تجربات و مشاہدات کی شکل میں گھلی ملی دکھائی دیتی ہے۔ ہر موضوع و مسائل کی توضیح شاعرانہ ڈھنگ سے کی گئی ہے۔ اسی لئے شعر میں تخلیقی کرب اور شدت احساس کی خوبصورتی زیادہ جامع اور موقر نظر آتی ہے۔

اپنی نظر بھی اب مجھے پہچانتی نہیں!
شاید تری نگاہ کرم کھا گئی مجھے

تتمتا اٹھی ہیں رات کی سیاہیاں
شاید اب کوئی ہمیں چراغ مل سکے

حالات کی اس دو رنگی میں کیا ساتھ ہمارا ان کا
گرداب ہماری قسمت میں' شاداب کنارا ان کا

غم زمانہ' غم عاشقی' غم فردا
ہم اہل دل کے لئے ہیں ہزار تعزیریں

ترا پیکر تو خیر اک مشعل تاباں تھا پہلے بھی
ترے سائے کو بھی ہم ضوفگن محسوس کرتے ہیں

قتیل ایسی بھی اک عورت ہے اس رشتوں کی بستی میں
کہ جو ماں ہے' نہ بیٹی ہے' نہ بہنا ہے

لاجونتی کی طرح جو مرے دل میں اتری
مجھ سے شرمانے کو شاید یہ جنم ہے اس کا

آنکھ جمنا ہے مری اس کے کنارے آ جا
میں نے بنوایا ہے اک تاج محل تیرے، لیے

سورج مرے دل میں جل رہا ہے
یہ موم کا گھر پگھل رہا ہے

شہر میں عجیب سی خبر اڑی ہے قتل کی
اس گلی میں اپنی لاش دیکھنے کو جائے کون

ظفر ادیب

گیتوں کے شاعر کی غزل

غزل کے عناصر میں رومان اور غزل کے اسلوب میں رومانی لہجہ سبھی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ رومان، حقیقت میں زندہ دلان پنجاب کا حصہ ہے اور یہ اس روایتی رومان سے جو روایتی غزل کی ریڑھ کی ہڈی رہا ہے اس سے مختلف ہے، یہ حسن و عشق کے نغموں اور ان کی نغمگی کے سوا کچھ اور ہی شے ہے، اسے "ماورائے شاعری چیزلے دگراست" ہی کہا جا سکتا ہے۔ اسے فنکاری سے زیادہ شعریت سے تعلق ہے یہ جنوں کو وجد آنے کی کیفیت رکھتا ہے، یوں بھی سرزمین پنجاب عشق و محبت کی سرزمین ہے۔ یہاں دریاؤں کے کنارے حسن و عشق سے آباد رہے ہیں۔، جیالا پن یہاں کے خمیر میں شامل ہے۔ روایتی غزل کا حسن یہاں حسن نہیں اور روایتی غزل کا عشق یہاں عشق نہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ یہاں کی غزل روایتی غزل نہیں پیکر کے اعتبار سے نہیں، روح کے اعتبار سے ____ یہاں کی غزل یہاں کے لوگوں کے سوا دوسرے لوگوں کی غزل سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ اگرچہ غالب کی غزل کا یہاں کی غزل پر غالب ہی اثر پڑا ہے، مگر یہاں کی فضا نے اس میں کچھ اور نغمگی اور رومانی کیفیت شامل کر کے اسے اپنے ہی انداز سے اپنا لیا ہے۔

پنجاب میں روایتی شاعری کے اسکول کی بجائے جس کا بڑا حصہ غزلیہ شاعری ہے اور جس کا اثر یہاں کے داغ اسکول یا یو---پی اسکول کے پیروکار افراد پر پڑا ہے جن کی تعداد کو غالب اکثریت کا بلکہ قابل لحاظ اکثریت کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ نظم

کی دلی' دماغی اور تجرباتی شاعری کا اسکول گرویدہ کئے رہا ہے۔ جس کا تعلق یہاں کے قدرتی ماحول اور اس کی پروردہ امنگوں سے ہے' پنجاب کی اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آپ کو نظم ہی کا پلا بھاری دکھائی دے گا اور یہی یہاں کا ممتاز بلکہ کسی حد تک غالب اسلوب ہے' اس کا تمامتر حسن رومانی روح اور پیکر کے ساتھ یہاں کی غزل میں آیا۔ پنجاب کے غزل گوؤں کے یہاں جنہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں یا معتد بہ تعداد میں غزلیں کہی ہیں نظم کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔ یہ یہاں کے لوگوں کی فطرت اور سیرت کا حصہ ہی نہیں خیال و جذبہ کی بنیاد بھی ہے جس کے بغیر شاعری شاعری نہیں ہو پاتی کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

اختر شیرانی کے یہاں ایک اور اسلوب پایا جاتا ہے جس کا رشتہ گیت سے ہے برج کے گیت سے نہیں۔ اگرچہ یہاں کے کچھ لوگوں نے برج کے گیت کی لے میں گیت کہے ہیں۔ جس گیت میں اختر شیرانی نے ایک اور اسلوب کا رشتہ ہے' وہ پنجاب کے ڈھولا اور ماہیا میں اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ یہ ایک اور اسلوب ان کے بعد کے لوگوں میں اور زیادہ نمایاں ہوا۔ ان کے یہاں ترکیب تو پاتا ہے لیکن پورے طور سے صورت نما نہیں ہوتا' اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اسلوب کی بنیاد انہیں کے ہاتھوں پڑی یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ ان کے خمیر میں پنجاب ایسا رچا بسا نہیں تھا جیسا اس کی پیروی کرنے والوں کے خمیر میں۔

ندیم اور راشد کے بعد آنے والے شاعروں میں قتیل اس اسلوب کا نمائندہ شاعر ہے۔ راشد کا اسلوب پہلے مغربی بعد میں ایرانی رہا اگرچہ انہیں جس انداز سے انہوں نے برتا اس انداز نے اسے ان کا اپنا ہی اسلوب بنا دیا۔ ندیم کے یہاں اس اسلوب کی ترقی یافتہ صورت پائی جاتی ہے' اگرچہ وہاں جہاں جہاں وہ شدت سے ترقی پسند ہوتے ہیں اس اسلوب کی نرمی' گھلاوٹ اور موہنی پن کو زک پہنچی ہے۔ یوں وہ بیشتر اسی اسلوب کے خدوخال ابھارتے رہے ہیں اور اسی اسلوب کے خصائص کو پروان چڑھاتے رہے ہیں۔ یہی جمالی کیفیت فیض کے یہاں پائی جاتی ہے جو جلالی ہو کر اقبال کے یہاں فیض سے برسوں پہلے گونجنے اور دل میں اترنے لگی تھی۔ ساحر کا

اسلوب اس اسلوب سے کچھ ہٹا ہوا ہے کیوں؟ نہ جانے اگرچہ انہوں نے ایک زمانہ لاہور جیسے حسین و جمیل شہر کی ہواؤں کو جزو جسم و جاں بنایا لیکن ان کے یہاں اس اسلوب کا وافر حصہ نہیں آیا' وہ نظم کی لے کو اونچا کیے رہے اور گیت کے جمیل حسن کی جانب ان کی نظر نہیں گئی۔ غزلیں کہی ہیں انہوں نے بھی' لیکن اختر شیرانی کے اس ایک اور اسلوب سے تھوڑا بہت ہٹ کر ہی۔ جو حسن ان کے یہاں روش روش دکھائی پڑتا ہے اسے ہم کسی اور کے حسن کا نام نہیں دے سکتے۔ وہ ان کا اپنا ہی انداز حسن ہے جس کی رگوں میں ترقی پسندی کا لہو دوڑتا ہے لیکن ترقی پسندی کی تحریکی چھاپ نہیں' وہ اول اور آخر شاعر رہے لیکن نظم کی کیفیت اور نظم کی لے کے ہی شاعر۔

قتیل نے گیت بھی لکھے' نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی کہیں مگر ان کے فن کا حسن اور شعر کا جمال غزل ہی میں نکھرتا ہے' اس کے بعد گیت کی کشش محسوس کی جاتی ہے۔ اگرچہ حیرت ہوتی ہے کہ ان کے یہاں یہ گیت کی روش کیونکر پروان چڑھی ' وہ سرحد کی فضاؤں میں جوان ہوئے اور مزاج بھی انہوں نے وہیں کا پایا' وہیں کی آب و ہوا اور فضا کا ان پر اثر نمایاں ہوا اسے غالباً" سوہنی مہینوال سسی پنوں ہیر رانجھے کا دیس نہیں کہا جا سکتا' وہ خوشحال خان خٹک کا دیس ہے اور خوشحال خاں خٹک کے دیس کا جیسا ترانہ ہوتا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ' اس میں تلواروں کی جھنکار ہوتی ہے' پائل کی نرم نغمگی نہیں۔ جمال کی جھمک نہیں ہوتی جلال کی کڑک ہوتی ہے' لہراؤ اور بہاؤ نہیں ہوتا' طوفان کی خس و خاشاک بہا لے جانے والی تیز و تندروانی ہوتی ہے۔ کیا ہوا' کیسے ہوا' اور کیوں ہوا مگر قتیل کے یہاں یہ ہوا' اس کے یہاں گیت کی گنگناہٹ آئی اور گیت کا بجیلا پن آیا اور گیت کی نرم اور ہلکی سریں آئیں۔

اس سے پہلے کہ قتیل کی غزل کے بارے میں کچھ کہوں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ قتیل فنکاری زدہ نہیں ہوئے وہ بیشتر شاعر رہے' اگرچہ کہیں کہیں وہ عجیب اور بعض حسین و خوش آہنگ ردیفوں کے چکر میں آئے اور کہیں کہیں تجرباتی رو میں بھی

بہہ نکلے' جیسے غزل کو متزاد کی صورت میں نہیں بلکہ ردیف کو متزاد کا حصہ بنا دیا گیا ایک دو مقامات پر شعری روایات سے انحراف بھی اختیار کیا' لیکن اس سے ان کی غزل پر جو ان امور سے پیشتر دامن بچاتی رہی اور انہوں نے جو خالص شاعر کی حیثیت سے کہی کوئی تاریک سایہ نہیں پڑتا بلکہ یہ امور ایک طرح سے چاند کی پرچھائیاں ہو جاتے ہیں جو بدنمائی کے داغ کا نام نہیں پا سکتیں۔ ایک اور بات جو اس کی ایک خوبی بھی قرار پاتی ہے اور عیب بھی ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری کے نو مجموعے آ چکے ہیں۔ جہاں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی طبع نہایت زرخیز ہے اور ان کا دل رنگا رنگ جذبات کا خزانہ ہے اور ان کی زندگی بے شمار تجربات میں سے گزری ہے' وہاں یہ بھی اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کچھ اعادہ چاہے بدلے ہوئے الفاظ ہی میں سہی اور کچھ محض کہنے کے طور پر کہی ہوئی باتیں آجائیں' اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے حسن بیان سے اور رنگین و ۔زومانی الفاظ سے ایک حد تک اس اندیشے کو واضح اور نمایاں نہیں ہونے دیتے۔ وہ شعر کے پیکر کو سجانے میں ماہر ہیں اور معانی کے لباس کو زیادہ سے زیادہ دلاویز بنانے کا فن جانتے ہیں' جس سے کان بجتے رہتے ہیں۔ اور آنکھیں چمک چمک اٹھتی رہتی ہیں' آپ ان کی کوئی غزل اس حسن سے مسحور ہوئے بغیر نہیں سن سکتے یا نہیں پڑھ سکتے۔ یہ حسن واقعی ہاتھ لگانے سے میلا ہو جانے والا حسن ہوتا ہے۔ اس کی تہہ میں یا اس حسین پردے کے پیچھے کیا ہے دیکھنے کی جرات یا حوصلہ کرنے کو بہت ہی کم جی چاہتا ہے۔

شاعر اور خالص شاعر کی روایت ہر دور میں رہی ہے۔ غزل کی نشاۃ ثانیہ کا تو انحصار ہی اسی روایت پر ہے جس کا نمائندہ بلکہ بانی شاعر حسرت موہانی ہوا۔ جس کی شاعری پر اس کی سماجی اور سیاسی زندگی کی ظاہر یا پوشیدہ چھوٹ بھی نہیں پڑتی' ان کی زندگی کے سیاسی پہلو کو دیکھئے تو کتنا غیر شاعرانہ ہو کر رہ گیا تھا' لیکن شعری پہلو شاعرانہ بالکل شاعرانہ ہی رہا۔ اگر کہیں کچھ سیاسی پہلو کا عمل دخل ہو گیا ہے تو وہ بھی بڑی حد تک شاعرانہ ہو گیا' ترقی پسند تحریک کے شاعروں کے قافلے میں مجاز اور فیض نمایاں رہے' مخدوم بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اگرچہ فیض اور مخدوم کی شاعری کا تھوڑا سا

حصہ نظریاتی بھی ہو گیا ہے لیکن بیشتر یہ تینوں شاعر ہی رہتے ہیں۔ ساحر کی بھی بالکل یہی روش رہی ہے، قتیل اگر ان سب سے زیادہ نہیں تو کسی سے کم بھی خالص شاعری نہیں رہتے بلکہ وہ شاعر ہی رہتے ہیں کہیں بھی غیر شاعرانہ روش اس کو منظور اور قبول نہیں ہوتی۔ یہی بات ہم جدید شاعری میں بانی مرحوم کے یہاں دیکھتے ہیں وہ جدیدیہ کم ہوا اور شاعر زیادہ رہا' اس کے یہ معنی ہر گز نہیں ہیں کہ ان کے یہاں فکری سمتیں اور وسعتیں نہیں ماپ لی گئیں یہ سب کچھ تو ہوا ہے لیکن ایک حسن اور دلسندھوی اور دلاویزی کے ساتھ ہوا ہے لذتیت یا چٹخارے پن کا گزر نہیں ہونے پاتا۔ جذبات کی صداقت زندہ اور سانس لیتی ہوئی رہتی ہے تجربات سڈول ہو کر ہی جا پاتے ہیں' محض تخیل کاری نہیں ہو پاتی، اصلیت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ زندگی یعنی اپنی زندگی میں غیر متعلق کوئی چیز نہیں آتی' لیکن اس انداز سے کہ وہ آپ بیتی نہیں رہتی سب کے دل ہی کی بات لے کر آتی ہے'اس میں جگ بیتی کا کھردرا پن بھی نہیں رہتا' سب کچھ بالکل تر شا تر شایا ہوا ہیرا ہی ہوتا ہے۔

قتیل غزل میں گیت اور گیت میں غزل کہتا ہوا پایا جاتا ہے' اس کی غزل بوجھل نہیں ہوتی' اضافتی اور عطفی ترکیبوں سے اور اس کا گیت ہلکا نہیں ہوتا ہزار بار کہے ہوئے اور بیان کئے ہوئے معاملات کی شمولیت سے-- وہ دونوں کا اپنا اپنا وزن اور وقار قائم رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کی غزل گیت کی کیفیت اور فضا لئے رہتی ہے لیکن وہ غزل کی انفرادیت کو باقی رکھتے ہیں اور اسے اس کی انفرادیت سے محروم نہیں ہونے دیتے بلکہ ایک نئے پن سے اسے روشناس کراتے ہیں اور ایک نئی طرح ڈالتے ہیں۔ جس میں وہ اپنی بھرپور شخصیت کے ساتھ جو رنگین اور حسین بلکہ صاف ستھری انسانیت اور انسان دوستی کی روشن مثال ہے جلوہ گر رہتے ہیں اور اپنے نہ جاننے والوں کو بھی اسی طرح مسحور کرتے ہیں جس طرح اپنے قدر دانوں اور پرستاروں کو۔

مشاعروں اور عوام میں ان کی مقبولیت دیکھ کر ساحر لدھیانوی (مرحوم) کی ان کے مجموعے "پیراہن" پر رائے سے سو فیصدی اتفاق مجھے ہی کیا ہر ایک شعر و ادب کے قدردان کو ہے اور ہونا چاہئے۔

"قتیل شفائی پاکستان کا ساحر لدھیانوی ہے اور ساحر لدھیانوی ہندوستان کا قتیل شفائی ____ میرے اور تمہارے شعری رویوں میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور قبول عام جسے بعض لوگ ہلکی چیز سمجھتے ہیں، مجھے بھی حاصل ہے اور تمہیں بھی اور سچ تو یہ ہے کہ پہچان کا یہ مقام بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے اور تمہاری شان تو یہ ہے کہ تمہیں پاکستان سے بڑھ کر ہندوستان میں پسند کیا جاتا ہے۔"

ساحر جیسے شاعر کو قتیل جیسے شاعر کے بارے میں اسی انداز سے رائے دینی چاہئے تھی، اپنی انا پر ایک منفرد فنکار کو باقی رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ جہاں یہ انداز نہیں آپاتا وہاں انفرادیت مشکوک ہی ہو جاتی ہے، اس کی مثالیں فارسی اور اردو ادب میں بھری پڑی ہیں اس زمانے میں بھی ہیں۔ اردو ہی کیا دوسری زبانوں میں بھی ____ شری پانڈے بے چین شرما اگر جب دیوان غالب کی شرح اپنے ہی انوکھے انداز سے لکھتے ہیں تو غالب کون ہے کے پہلو بہ پہلو اگر کون ہے، بھی لکھنے سے نہیں ہچکچاتے۔ اب قتیل کی شاعری کے بارے میں اس دور کے سب سے بڑے بین الاقوامی شہرت کے شاعر کی رائے بھی ایک اور ہی پہلو سے اہمیت رکھتی ہے۔ فیض 'گفتگو' کے شروع میں منفردِ رنگ کی منفرد مثال کے تحت لکھتے ہیں۔ "یوں تو انہوں (قتیل) نے بہت سے اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس قبول عام کا سہرا غالبا" ان کی غزل ہی کے سر ہے۔ ان کا لہجہ ہمیشہ مطربانہ ہے اور ان کی فکر ہمیشہ سے درد مندانہ---- طرب اور درد کے درمیان جو بہت سے مقامات پڑتے ہیں کوئی رنگین، کوئی ویران، کوئی بارونق، کوئی اداس، قتیل صاحب نے مختلف پیرایوں میں انہی کی منظر کشی کی ہے۔ اور اس کاوش میں انسان دوستی اور امید فردا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔"

یہ قتیل کی شاعری کے ایک اور پہلو کو آئینہ دکھاتی ہے اگرچہ اس میں ایک مسلک پس پشت سے جھانکتا ہوا جان پڑتا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ قتیل کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہی رہا ہے۔ ان دونوں رایوں کے ساتھ قتیل کی شاعری کو اور زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں پیش کرنے کے لئے ایک مثال بھی پیش کر دوں تو کوئی بے جا نہ ہو گا۔ اس لئے بھی کہ اسے نہایت تطابق حاصل ہے اور دوسرے فن، حقیقی فن

کے حسن کو اس سے بہتر طور پر نہیں سراہا جا سکتا' فن کی واقعی پہچان کے ساتھ ______ 'تاج محل' پر ایک انگریز مصنف اپنی ذاتی واردات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے۔ اتفاق سے وہ تعمیرات کے رموز سے بھی آگاہ تھا اور تعمیر کے حسن و قبح سے متعلق گہری نظر رکھتا تھا۔

"میں تاج محل کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سحرزدہ ہو گیا' جس طرف نظر جاتی اسی طرف کی ہو جاتی' ہر ایک شے اور ہر ایک چیز پہلے تصور سے زیادہ حسین و جمیل تھا۔ الفاظ نہیں پائے جا رہے تھے کہ جن میں اس حسن و جمال کا کما حقہ' نہیں تو تھوڑا بہت اعتراف کر سکتا' جتنا وقت احاطے سے باہر نہ آیا اسی ماحول اور اسی خیال میں رہا لیکن جیسے ہی احاطے کے پھاٹک سے باہر آیا تو جمالیات کا سحر چھٹنے لگا اور عقلیات نے پر پرزے نکالے اور میں تعمیر کے عیب اور نقص ڈھونڈھنے میں کامیاب ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔"

غالباً" یہی جمالیات اور عقلیات کا فرق ہے جو یہ کہنے پر بھی جب کبھی ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں مجبور کر دیتا ہے۔

کیونکہ اس طرح کے دورے اس وقت پڑتے ہیں جب کوئی جمالیات سے محروم ہو جاتا ہے اور عقلیات کا اثر اس پر حاوی ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آرٹ ادب اور فن لطیف ماپ تول اور کسوٹی پر کسنے کی چیزیں نہیں مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ معیارات سے بے نیاز ہو جائے وہ بھی ایک چیز ہی ہیں۔

اسی سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آتی ہے میں اسے بیان کرنے کی ترغیب کو نہیں روک پا رہا ہوں چونکہ اسی جمالیات سے رشتہ ہے اس کا اس لیئے وہ کچھ مناسب ہی ہو جاتی ہے۔

غالباً" 1947ء ہی کی بات ہے' میں حضرت احسان دانش کے ساتھ مکتبہ دانش کا شریک تھا۔ بیڈن روڈ کی چوتھی منزل کے دفتر میں دن گزرتا تھا۔ بہت دنوں سے مکتبہ دانش کا بورڈ لکھنے کو پڑا تھا' احسان صاحب نے سرفراز آرٹسٹ (میکلوڈ روڈ) کے ذمے یہ کام لگایا ہوا تھا۔ لیکن وہ موڈ میں نہیں آ رہے تھے۔ ایک دن بولے "چلے استاد!

آج آپ کا بورڈ لکھ دیں" دو مشہور کاتب' میں اور احسان دانش چلے۔ سرفراز نے بورڈ کا نگاہوں ہی نگاہوں میں اندازہ لیا اور برش رنگ میں بھر کر بورڈ پر پھیر دیا۔ ایک ہی ہاتھ میں بورڈ لکھا گیا کہیں نوک پلک سنوارنے کی ضرورت نہیں پڑی' جب یہ ہو گیا تو سرفراز کاتبوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ "دیکھ لو استادو! کہیں کوئی کور کسر تو نہیں رہ گئی" کاتب بولے "کہ ظالم! تو تو اگر سیاہی مل کر زمین پر لوٹ جائے تو ادب کا شاہکار پیش کردے۔" یہ جمالیات کا معاملہ ہے' جب وجدان پر آتا ہے' تو معجزے سے کم پر نہیں ٹھہرتا۔

بات ہو رہی تھی قتیل شفائی کی غزلیہ شاعری کی۔ جس نے خواص و عوام میں اپنی محبوبیت کی انتہا کو چھو لیا ہے۔ اور جس کا فنی اور شعری تجزیہ کرتے ہوئے بھی جی ہچکچاتا ہے' کیونکہ اس عمل میں ایک خوبصورت چیز کے کسی قدر ہی سہی مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔ حسن تو چیز ہی ایسی ہے جسے عشق کی بے باک نگاہیں بھی جراحت پذیر ہونا گوارا نہیں کرتیں۔ اور انہیں کہیں بھی اس کے ساتھ سایے کی پرچھائیں نہیں دکھائی دیتیں ایسی چیز پر تو بے رحم نقاد بھی جھجک جھجک کر رہ جاتا ہے کیونکہ ابھی تک اس کے سینے میں دل زندہ ہے اور دل زندہ اپنی ہی زندگی سے بے نیازی نہیں برت سکتا۔ خدا کرے کہ اسے سخن سازی یا انشاء پردازی نہ سمجھے۔

اگرچہ قتیل کے غالبا" نو عدد مجموعہ ہائے شاعری ہیں۔ میرے پیش نظر اس مقالے کے سلسلے میں "گفتگو" اور "پیراہن" رہے ہیں۔ کچھ اور غزلیں بھی۔۔ جو ممکن ہے ان کے دوسرے مجموعوں میں "شامل" ہوں' لیکن میں نے انہیں کچھ جرائد ہی میں دیکھا ہے۔ یہ مجموعے مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہیں' گیت بھی' غزلیں اور نظمیں بھی ان کے دامن میں ہیں۔ مطربہ طوائف کے موضوع سے متعلق ہے۔ چھتنار میں جدید رنگ کی رونمائی ہے۔ گفتگو اور پیراہن صرف غزلوں ہی پر مشتمل ہیں اور یہ ترتیب کے اعتبار سے تازہ ترین ہی ہیں۔ ان کی شاعری پچاس برس کی مدت پر پھیلی ہوئی ہے' بارہ برس کی عمر میں اپنی پہلی شعری کاوش پر انعام ملا۔ 1944ء سے وہ جانے پہچانے شعراء کی صف میں پائے جانے لگے' دسیوں اعزازات اور انعامات

حاصل کئے جن میں قومی پیمانے کے بھی کئی ایک ہیں۔ ہری پور ہزارہ میں تو وہ کچھ زیادہ نمایاں نہیں تھے اور ان کا انداز شاعری بھی بیشتر روایتی ہی تھا۔ لیکن ندیم قاسمی سے راہ رسم اور اختر شیرانی کے اثر کی ہمہ گیری اور اس دور کے شعری انداز و اسلوب نے انہیں ممتاز بنایا اور لاہور آ جانے پر تو وہ اپنی ہی طرح حسین و جمیل غزلیں کہنے لگے پھر تو عمر کے ساتھ ساتھ اور وقت کے ساتھ ساتھ رعنائیاں ہمراہ ہو گئیں اور آج وہ رعنائیوں کا ڈھیر ہو رہے ہیں۔ خصوصاً" اپنی غزل میں' دوسری اصناف بھی قابل لحاظ طور پر اپنے نک سک سنوار لیتی ہیں لیکن غزل کی بات ہی کچھ اور ہے' میرے خیال میں اس کے بعد ہی ان کے گیت کا نمبر آتا ہے' ممکن ہے کچھ لوگ میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں اور ان کے گیت ہی کو ان کی جان شاعری قرار دیں۔

اب قتیل کی رنگ بھری پچکاریوں کی ہولی دیکھئے' میں اس بات کی جہاں تک ممکن ہو سکے گا احتیاط کروں گا کہ مثالی اشعار کی پیشکش کے سبب یہ مقالہ طویل اور گراں نہ ہو جائے اس لئے بھی کہ ان کی پوری شاعری کا انتخاب بھی پیش کیا جانا ہے اگرچہ انتخاب کرنے والے کی اپنی پسند کی چھاپ اس انتخاب پر ہو گی' پھر بھی اس امر کا امکان ہے کہ کچھ اعادہ واقع ہو جائے۔ ان اشعار میں جو میں شامل مقالہ کرنا چاہوں گا' اس سے یہ تو فرض نہیں ہو جاتا کہ میں ان اشعار کو درج نہ کروں جن کی بنیاد پر قتیل کی غزلیہ شاعری کے اوصاف سے متعلق ذہن بنا ہے اور جو اس مقالہ میں شروع ہی سے ایک زیریں لہر کی طرح سے کارگر رہا ہے۔ پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میری ہی پسند اوروں کی پسند بھی ہو جائیگی لیکن اس مقالے کے ساتھ ان کا تعلق روح اور جگر کا تعلق ہے' شاید ہی اس سے کسی کو انکار ہو سکے۔

پیراہن

ابتدائیہ (جس کا ایک مصرع ہے "شیشہ کند نہ ہونے پائے ساری عمر مرے فن کا" اور جس میں واضح اشارہ موجود ہے زندہ جذبات کے زندہ بت تراشنا وہ جذبات نہیں جو محض خواب و خیال میں وجود رکھتے ہیں یا جن کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہوتی

بلکہ وہ جو تجربات اور واردات کی وادیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جنہیں فنکار اپنے شیشے سے تراش کر زندہ جاوید' دھڑکتے ہوئے دل والے بت بنا دیتا ہے) اور دعائیہ (جس کا ایک مصرع "اسے کوئی تخلیق ہمیشہ زندہ رہنے والی دے" اور جس کا رشتہ بھی ابتدائیہ کے مندرجہ بالا مصرع سے جڑا ہوا ہے) اور اختتامیہ کے درمیان (جس کا ایک شعر ہے "جشن بہاراں اب کے بھی ہم نے منا ڈالا ہے مگر / گلشن سے باہر تھی صبا' قحط صبا گلشن میں تھا۔" اگر اسی طرح ہے' غزلیں ہی غزلیں ہیں جیسے پھولوں کا ڈھیر رنگ بھی ہے اور مہک بھی' جسے قتیل کی شخصیت اور شاعری خصوصاً" غزلیہ شاعری کا انفرادی اور امتیازی پہلو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔

غزل یعنی اپنی غزل کا تعارف بمعنی تعریف ایک غزل کے مطلع میں دیتے ہیں۔

سخن بریدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لئے اب غزل ہی باقی ہے

کیا ہی بچی عصریت لئے ہوئے یہ شعر ہیں' کیا اس سے کوئی صاحب ضمیر انکار کر سکتا ہے۔

ہر کسی کو فکر ہے اب اپنے اپنے جام کی
جاؤ گے اب کیا تمنا لے کے میخانوں میں تم

سو گئے ہیں وہ تو چادر پتھروں کی تان کر
ڈھونڈتے تھے جن خداؤں کو صنم خانوں میں تم

تم تو ساحل پر گڑے ہو ایک پتھر کی طرح
کشتیوں کا رقص کیا دیکھو گے طوفانوں میں تم

کیا اس آخری شعر سے زیادہ خوبصورت امتزاج جدیدیت اور غیر جدیدیت کے درمیان ہو سکتا ہے؟ غزل کی آبرو بھی بے داغ رہتی ہے اور جدیدیت کی بات بھی ہو جاتی ہے۔

قتیل غزل میں رنگ اقبال سے نہیں بچ سکے شاید بچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اگرچہ اس میں ایک یا دوسرے پہلو سے اپنا پن لے آنے کی فکر بھی انہیں رہی۔

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا
مشکوک نظر سے مجھے تکتی ہے یہ دھرتی
کیوں عرش معلیٰ میرے سر پر نہیں گرتا
کرنا ہے جو سر معرکۂ زیست تو سن لے
بے بازوئے حیدر در خیبر نہیں گرتا

یہ اپنے معروف رنگ سے ہٹتے ہوئے ان کا انداز بھی دیکھئے۔

تیز دھوپ میں آئی ایسی لہر سردی کی
موم کا ہر اک پتلا بچ گیا پگھلنے سے

کب سننے دیتی ہے، شور سمندر کا
پانی کی اک بوند جو میرے کان میں ہے

ٹانک دو اس میں اک مصنوعی تتلی بھی
کاغذ کا جو گلدستہ گلدان میں ہے

اپنے ہجر کے پس منظر میں جھانک مجھے
میری سب روداد اسی عنوان میں ہے

ان کو پیڑوں میں چھپی آگ دکھائے کوئی
وہ جو بیٹھے ہیں چناروں کی گھنی چھاؤں میں

کرتے رہو تم ثنائے ساقی
خالی ہے، میرا گلاس لوگو

وہ شخص برا تھا نہ وہ ہرجائی تھا
اس کو فقط اندیشہء رسوائی تھا

میری اونچائی تو میرے سر ہوتی ہے شروع
میرے قد میں ڈھونڈتے ہیں لوگ میرے ناپ کو

چپ نے پنجے گاڑ دیئے کہرام کے سینے میں
سوچ اسیر دام ہوئی اب آگے کیا ہوگا

اور یہ لہجہ دیکھئے جس میں ساحر کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہے یا جس پر ساحر کی پرچھائیں پڑ جاتی ہے۔

موت برحق ہے مگر میری گزارش یہ ہے
زندہ انساں کا جنازہ نہ اٹھایا جائے
قدر جس سے رس و دار کی بڑھ جاتی ہے
مجھ کو اس حرف ندامت سے بچایا جائے

گفتگو

حمد کا رنگ روپ لئے آغاز گفتگو سے سفر شروع کرتا اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ودیعت کیا ہوا کہتا ہے۔

سب حمد و ثنا تیرے لئے ہے میرے مولا
تو وہ ہے کہ جس نے مجھے توفیق ہنر دی
تخیل پہ اتری تیرے انوار کی شبنم
میں رات کا راہی تھا مجھے تو نے سحر دی

پہنچایا مجھے تو نے سمندر کی تہوں میں
قلاش کو تو نے خبر لعل و گہر دی

صد شکر کہ تو نے مجھے فنکار سمجھ کر
کلیوں کے چٹکنے سے مجھے اپنی خبر دی

اب غزلوں کے اشعار دیکھئے جو بالکل ان کے اپنے اور معروف رنگ و آہنگ کا پتہ دیتے ہیں۔

کیا بتاؤں دوستو! ان کے خیال آنے کا خیال
جھلملاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا

اپنے قریب پا کے معطر سی آہٹیں
میں بارہا سنکتی ہوا سے لپٹ گیا

سہما سہما سا اک سایا مہکی مہکی سی اک چاپ
پچھلی رات میرے آنگن میں آ پہنچے وہ اپنے آپ

کسی دلہن کے جھمکتے ہوئے جھومر کی طرح
رات نے صبح کے ماتھے پہ سجایا سورج

شب کو بھی روح کے آنگن میں رہی دھوپ قتیل
چاند تاروں نے بھی آ کر نہ بجھایا سورج

تتلیوں کا رنگ ہو یا جھومتے بادل کا رنگ
ہم نے ہر اک رنگ کو جانا ترے آنچل کا رنگ

یہ کسک بھی کہیں کہیں جھانک پڑتی ہے' جو توقعات پوری نہ ہونے پر دلوں میں جھلملاتی رہتی ہے۔

چار جانب جس کی رعنائی کے چرچے ہیں قتیل
جانے کب دیکھیں گے ہم اس آنے والی کل کا رنگ

اور یہ غزل میں گیت کا رنگ

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال
ہر آنگن میں بجے نہ تیرے اجلے روپ کی دھوپ
چھیل چھبیلی رانی تھوڑا گھونگھٹ اور نکال

پھر یہ دار و رسن کی بات غزل کا لہجہ لئے ہوئے طرح طرح سے اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔

کھلا ہے جھوٹ کا بازار، سچ بولیں
نہ ہو بلا سے خریدار، آؤ سچ بولیں
سکوت چھایا ہے انسانیت کی قدروں پر
یہی ہے موقعء اظہار آؤ سچ بولیں
ہمیں گواہ بنایا ہے وقت نے اپنا
بنام عظمت کردار آؤ سچ بولیں
تمام شہر میں کیا ایک بھی نہیں منصور
کہیں گے کیا رسن و دار، آؤ سچ بولیں

اور اپنے ماضی کو کتنے پیار سے یاد کرتے ہیں۔

وادیء سربن میں تھیں جو مہرباں مجھ پر قتیل
وہ بہاریں ڈھونڈتی ہیں اب مجھے پنجاب میں

کاش ان بہاروں کا بھی کہیں ذکر پایا جاتا، گیتوں اور غزلوں میں تو لفظ و بیان کی رنگینی میں آثار پائے جاتے ہیں۔

"جب بھی آتا ہے میرا نام ترے نام کے ساتھ۔ جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں" کی آواز اور لہجہ یہاں بھی پایا جاتا ہے۔

کیا خبر کب نیند آئے دیدۂ بے خواب میں
شام سے ہم جل رہے ہیں سایۂ مہتاب میں
جس گلی میں گھر تمہارا ہے کرو اس کا خیال
ہم تو ہیں بدنام اپنے حلقۂ احباب میں

اور یہ جدید رنگ جس کی پرچھائیاں "پیراہن" میں اور گہری ہوئیں۔

بکھرا پڑا ہے تیرے ہی گھر میں ترا وجود
بیکار محفلوں میں تجھے ڈھونڈتا ہوں میں
میں خود کشی کے جرم کا کرتا ہوں اعتراف
اپنے بدن کی قبر میں کب سے گرا ہوں میں
پہنچا جو تیرے در پہ تو محسوس یہ ہوا
لمبی سی اک قطار میں جیسے کھڑا ہوں میں

پودا پودا پال کے وقت نہ ضائع کر
کاغذ کے کچھ پھول سجا گلدانوں میں

رات کے بعد سحر بھی آئی
اپنا اک خواب تو سچا نکلا

قتیل لوٹ لوٹ کر اس لہجے اور انداز پر آتے ہیں۔ غالباً" یہی ان کا اصل رنگ ہے۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجالے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو

میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو

پھولوں کی اداسی کو چھپا جاتی ہے خوشبو
اڑتا ہے کوئی رنگ تو چھا جاتی ہے خوشبو

پربتوں سے نکل آئیں گے تھرکتے پیکر
نغمہ زن خامشی سنگ دکھائی دے گی

خدا کرے کبھی ایسا ہو، یہ دور ایسا آیا ہے کہ اس کا امکان بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔

رات یوں چاند کو دیکھا ہے ندی میں رقصاں
رات جھومر ترے ماتھے پہ ہلا کرتا ہے
لوگ کہتے ہیں جسے نیل کنول وہ تو قتیل
شب کو ان جھیل سی آنکھوں میں کھلا کرتا ہے

آئے تھے جس کی دید کو جھونکے بہار کے
میرے بدن میں پھر وہی خوشبو رچا ہے

تو ہمیں جب کبھی یاد آئے
چیت کی چاندنی یاد آئے
کیا ہوئیں جگنوؤں سی وہ آنکھیں
رات برسات کی یاد آئے

وہ جب سے گیا شہر میں ہے قحط رقیباں

اس شہر کی رونق تھی اسی شخص کے دم سے

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

زمانہ درد کے صحرا تک آج لے آیا
گزار کر تیری زلفوں کے سائے سائے مجھے

اس رنگ کے ساتھ قتیل کے یہاں غزل کا یہ اپنی ہی پہچان لئے ہوئے رنگ بھی ہے۔

مچا ہے شور سا ہونٹوں کے پیچھے
یہی چپ ہے تو پھر آواز کیا ہے

مجھے خوف آ رہا ہے قہقہوں سے
بھلا رونے کا یہ انداز کیا ہے

میں آپ اپنا تعاقب کر رہا ہوں
یہ عالم اے میرے دم ساز کیا ہے

سبھی خاموش ہیں پیاسے بھی رہ کر
تری محفل کا یہ اعجاز کیا ہے

مگر یہ آنکھوں میں کھلتے ہوئے کنول دیکھنے والا شاعر ستاروں کو بھی اپنی غزل سناتا ہوا پایا جاتا ہے۔

تری آنکھوں میں جب کھلتے ہوئے دیکھے کنول میں نے
ستاروں کو سنائی دیر تک اپنی غزل میں نے

نہ ہوگا سو برس کی عمر میں بھی یہ سکوں حاصل
گزارا تجھ سے مل کر جس طرح ایک ایک پل میں نے

ہزار شیوہ غزل کا یہ ہزار شیوہ غزل گو اس آواز کو بھی اپنے ساز دل سے نکالتا ہے۔

مل جل کے برہنہ جسے دنیا نے کیا ہے
اس درد نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے
میں ریت کے دریا پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اس شہر میں پانی تو یزیدوں نے پیا ہے
اے گورکنو! قبر کا دے کر مجھے دھوکا
تم نے تو خلاؤں میں مجھے گاڑ دیا ہے

ٹوٹی ہوئی مسجد میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
محفوظ شوالے کا گجر ہے کہ نہیں ہے

مگر گھوم پھر کر پھر اپنے مرکز کی طرف آ جاتا ہے اور اپنے محور کے دائرے کو کبھی بھول نہیں جاتا۔

کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں چراغ سے وہ بدن
ترس گئی ہیں نگاہیں کنول کنول کیلئے
نئے موسم بڑے بے درد نکلے
ہرے پیڑوں کے پتے زرد نکلے
دلوں کی برف پہنچی عارضوں تک
یہ انگارے بھی کتنے سرد نکلے
دکھائے خواب سے کچھ آہٹوں نے
بدن بنتا گیا پرچھائیوں کا

اللہ اللہ یہ کیفیت دل اور یہ صورت حالات۔

ہے شہر میں قحط پتھروں کا
جذبات کے زخم کھا رہا ہوں
ممکن ہے جواب دے اداسی
در اپنا ہی کھٹکھٹا رہا ہوں
آیا نہ قتیلؔ دوست کوئی
سایوں کو گلے لگا رہا ہوں

اور اس مجموعے کا یہ آخری شعر

جب پوپھٹی تو بڑھ کر، کچھ نا امیدیوں نے مجھ سے قتیلؔ پوچھا
کیا تو ہی ہے جو اب تک، موہوم آہٹوں کی جھنکار سن رہا تھا

کچھ اور ادھر ادھر سے ---- شاید اب تک چھپے ہوئے مجموعوں سے باہر کی غزلوں سے۔

ہر طرف جنگل ہی جنگل بستیوں کے درمیاں
شیر، چیتے اژدھا اور میں اکیلا آدمی
گھومتا پھرتا ہوں شاید کوئی مجھ سا آ ملے
غم کے میلے جا بجا اور میں اکیلا آدمی
مل کے حوا سے کیا آباد اسے میں نے قتیلؔ
یہ جہاں میری عطا اور میں اکیلا آدمی

یہ اکیلا آدمی متوقع آدمی ہی ہے جو ماضی میں تو رہا بھی مگر مستقبل میں اس کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ یوں دنیا نہ کبھی خالی رہی نہ کبھی خالی رہے گی۔ لیکن منظر عام پر اور ہر کہیں آدمی نما آدمی ہی پایا جاتا ہے اور پایا جائے گا۔ کیونکہ پیغمبروں کا سلسلہ تو بند ہو گیا جب پیغمبر ہی نہیں تو صحابہ کہاں ہاں درویشوں اور صوفیوں اور فقیروں میں کچھ لوگ نکل آیا کریں گے جو آدمی کی جھلک دکھاتے رہا کریں گے۔

ایسے ہی جیسے برسات کی رات میں جگنو کی چمک۔

رات لگا تھا پیار کا میلہ نکلا تھا پونم کا چاند
بیٹھا تھا میں جہاں اکیلا پل بھر وہاں نہ چمکا چاند
مست پون کے جھونکے شاید انہیں بھی لے آتے
کاش ابھی کچھ دیر نہ چھپتا رہ تکتا موسم کا چاند
چٹک رہی تھیں آس کی کلیاں کوک رہی تھی کوئل بھی
یاد بہت آیا ایسے میں تیرے قول قسم کا چاند
وصل کی رات کا راج دلارا، آیا ہجر کے لمحوں میں
ہائے یہ کس عالم میں دیکھا میں نے کس عالم کا چاند

یہ گیتوں کے شاعر کی غزل گیت کی فضا بھی رکھتی ہے اور گیت کی روح بھی۔ لیکن ردیف کی پٹریاں جہاں خوش آہنگ جھنکار پیدا کرتی ہیں وہاں کچھ دھڑکنوں کو گنگنانے نہیں دیتیں۔

"فن اور شخصیت" کے غزل نمبر میں جو غزلیں دی ہیں ان کے منتخب شعر درج ذیل ہیں۔ ان کا حوالہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ تاریخ شعر میں رہ جانے والی غزلیں تصور کی گئی ہیں اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے، پھر یہ انتخاب جانثار اختر کا کیا ہوا ہے۔

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

ایک اور مشہور غزل کے چار شعر درج ہیں۔ چار ہی شعر اس غزل کے بھی ہیں، زبان زد عوام یہ شعر ہے۔

جب بھی آتا ہے میرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

تین غزلیں "گفتگو" سے لی ہوئی ہیں (1) منظر سمیٹ لائے ہیں جو تیرے گاؤں کے (2) ہر بے زبان کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو (3) رنگ جدا، آہنگ جدا، مہکار جدا، ــــ ایک اور غزل ہے جس کے یہ شعر توجہ کش ہیں۔

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی
اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

کچھ اس انداز کے تیور اور بیان اپنے شعروں کو قتیل دے دیتے ہیں کہ وہ نہایت دلربا، سحر کن اور ظرف آزما ہو جاتے ہیں۔ سننے والے تو بعض اوقات ماہیء بے آب سے دکھائی پڑتے ہیں اور پڑھنے والوں پر بھی، ایسی تو نہیں، کچھ ہی اس سے کم کیفیت پائی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادو جگانے کی صلاحیت ان میں خداداد ہی ہے اور یہی صلاحیت انہیں ہندو پاک کا نہایت پیارا اور دلاویز شاعر بنائے ہوئے ہے۔

'اوراق'، سالنامہ 1947ء میں دو غزلیں ہیں۔ یقیناً کسی نہ کسی مجموعے میں آ گئی ہوں گی کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا اگر ان کے بعض اشعار جو مجھے "رسوا کرنے والے ہوں" یہاں دے دوں شاید ان سے کوئی ایسا پہلو تکمیل پا جائے جو اس سارے مقالے میں تشنہ رہ گیا ہے۔

کچھ بھی ہو آپ کے ماحول کا معیار حیات
آپ کے ذہن میں تصویر ہماری ہو گی
تہمتوں سے ہمیں دے گا یہ جہاں داد وفا
اب اسی ڈھنگ سے توقیر ہماری ہو گی

کوئی بات دل میں وہ ٹھان کے نہ الجھ پڑے تری شان سے
وہ نیاز مند جو سر بہ خم، کئی دن سے تیرے حضور ہے

میں نکل کے بھی تیرے دام سے نہ گروں گا اپنے مقام سے
میں قتیلِ تیغِ جفا سہی، مجھے تجھ سے عشق ضرور ہے

شاید میں کسی حد تک قتیل کی غزلیہ شخصیت کو پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور کوئی پہلو نظر انداز نہ ہوا ہو جو اس کی غزل کو ایک امتیازی شان دیتا ہو۔ میری کوشش رہی ہے کہ کہیں سخن گسترانہ بات نہ آپڑے اور قتیل اور قتیل کے پرستاروں کی توقعات اگر کما حقہ، نہیں تو بڑی حد تک پوری ہو جائیں۔ یہ میں کر سکتا ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ اصحاب الرائے پر ہے، اگرچہ میں اپنے زعم میں اس سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں۔

درد سے میرا دامن بھر دے یا اللہ
پھر چاہا ہے دیوانہ کر دے یا اللہ

میں نے تجھ سے چاند' ستارے کب مانگے
روشن دل 'بیدار نظر دے یا اللہ

میرے کاندھے جس کو اپنا جان سکیں
مجھ کو سوچنے والا سر دے یا اللہ

دھوپ میں چلنے والے موم کے لشکر کو
کوئی سایہ دار شجر دے یا اللہ

سورج سی اک چیز کو ہم سب دیکھ چکے
سچ مچ کی اب کوئی سحر دے یا اللہ

دم گھٹتا ہے اپنا تنگ جزیروں میں
کوئی لامحدود نگر دے ---- یااللہ

سینہ تان کے چلتا رہنے دے مجھ کو
دینا ہے تو اپنا ڈر دے یااللہ

یا دھرتی کے زخموں پر مرہم رکھ دے
یا میرا دل پتھر کر دے یااللہ

وہ شخص کہ میں جس سے محبت نہیں کرتا
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے نفرت نہیں کرتا

پکڑا ہی گیا ہوں تو مجھے دار پہ کھینچو!
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا

کیوں بخش دیا مجھ سے گنہگار کو مولا
منصف تو کسی سے بھی رعایت نہیں کرتا

گھر والوں کو غفلت پہ سبھی کوس رہے ہیں
چوروں کو مگر کوئی ملامت نہیں کرتا

کس قوم کے دل میں نہیں جذبات براہیم
کس ملک پہ نمرود حکومت نہیں کرتا

دیتے ہیں اجالے مرے سجدوں کی گواہی
میں چھپ کے اندھیروں میں عبادت نہیں کرتا

بھولا نہیں میں آج بھی آداب جوانی!
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

انسان یہ سمجھیں کہ یہاں دفن خدا ہے
میں ایسے مزاروں کی زیارت نہیں کرتا

دنیا میں قتیلؔ اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں

کیا خبر کب کسی انسان پہ چھت آن گرے
قریۂ سنگ ہے اور کانچ کی تعمیریں ہیں

لٹ گئے مفت میں دونوں، تری دولت، مرا دل
اے سخی! تیری مری ایک سی تقدیریں ہیں

کوئی افواہ گلا کاٹ نہ ڈالے اپنا
یہ زبانیں ہیں کہ چلتی ہوئی شمشیریں ہیں

ہم جو ناخواندہ نہیں ہیں تو چلو آؤ پڑھیں
وہ جو دیوار پہ لکھی ہوئی تحریریں ہیں

ہو نہ ہو یہ کوئی سچ بولنے والا ہے قتیلؔ
جس کے ہاتھوں میں قلم پاؤں میں زنجیریں ہیں

پریشاں رات ساری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ
سکوت مرگ طاری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ

ہنسو اور ہنستے ہنستے ڈوبتے جاؤ خلاؤں میں
ہمی پر رات بھاری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں تو آج شب پوپھٹے تک جاگنا ہوگا
یہی قسمت ہماری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ

تمہیں کیا آج بھی کوئی اگر ملنے نہیں آیا
یہ بازی ہم نے ہاری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ

کہے جاتے ہو رو رو کرہمارا حال دنیا سے
یہ کیسی راز داری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں بھی نیند آ جائیگی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے' ستارو تم تو سو جاؤ

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھکو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھکو

میں جو کانٹا ہوں توچل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھکو

میں کھلے در کے کسی گھر کا ہوں ساماں پیارے
تو دبے پاؤں کبھی آ کے چرا لے مجھکو

ترک الفت کی قسم بھی کوئی ہوتی ہے قسم
تو کبھی یاد تو کر بھولنے والے مجھکو

مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھکو

میں سمندر بھی ہوں، موتی بھی ہوں، غوطہ زن بھی
کوئی بھی نام مرا لے کے بلا لے مجھکو!

تو نے دیکھا نہیں آئینے سے آگے کچھ بھی
خود پرستی میں کہیں تو نہ گنوا لے مجھکو

کل کی بات اور ہے میں اب سا رہوں یا نہ رہوں
جتنا جی چاہے ترا، آج ستا لے مجھکو

خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تو نے اگر میرے حوالے مجھکو

بادہ پھر بادہ ہے میں زہر بھی پی جاؤں قتیل
شرط یہ ہے کوئی باہوں میں سنبھالے مجھکو

یہ اداس اداس ٹھنڈک جو اسیر ہے پون میں
کہیں بجلیاں نہ بھر دے کسی گوشہ چمن میں

یہ عجیب فصل گل ہے کہ کسی بھی گل کی رنگت
نہ جچی مری نظر میں' نہ رچی ترے بدن میں

میں طلوع صبح نو سے ابھی مطمئن نہیں ہوں
ترا حسن بھی تو ہوتا کسی خوش نما کرن میں

سربام بھی پکارا' لب دار بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا تری دید کی لگن میں

مری مفلسی سے بچ کر کہیں اور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

میں لئے لئے پھرا ہوں غم زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں کبھی تیری انجمن میں

ترے غم میں بہہ گیا ہے مرا ایک ایک آنسو
نہیں اب کوئی ستارا جو چمک سکے گگن میں

میں قتیل وہ مسافر ہوں جہان بے بسی کا
جو بھٹک کے رہ گیا ہو کسی اجنبی وطن میں

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اک تو ہی دھنوان ہے گوری' باقی سب کنگال

ہر آنگن میں سجے نہ تیرے اجلے روپ کی دھوپ
چھیل چھبیلی رانی تھوڑا گھونگھٹ اور نکال

بھر بھر نظریں دیکھیں تجھ کو آتے جاتے لوگ
دیکھ تجھے بدنام نہ کر دے یہ ہرنی سی چال

کتنی سندر نار ہو کوئی میں آواز نہ دوں
تجھ سا جس کا نام نہیں ہے وہ جی کا جنجال

سامنے تو آئے تو دھڑکیں مل کر لاکھوں دل
اب جانا' دھرتی پر کیسے آتے ہیں بھونچال

بیچ میں رنگ محل ہے تیرا کھائی چاروں اور
ہم سے ملنے کی اب گوری تو ہی راہ نکال

کر سکتے ہیں چاہ تری اب سرمد یا منصور
ملے کسی کو دار یہاں اور کھنچے کسی کی کھال

یہ دنیا ہے خود غرضوں کی لیکن یار قتیل
تو نے ہمارا ساتھ دیا تو جیئے ہزاروں سال

یہ مرا شہرِ وفا اور میں اکیلا آدمی
میرے لاکھوں آشنا اور میں اکیلا آدمی

ایک ہی سر ہے جھکا سکتا ہوں کس کس کے لئے
ان گنت میرے خدا اور میں اکیلا آدمی

گھومتا پھرتا ہوں شاید مجھ سا کوئی آ ملے
غم کے میلے جا بجا اور میں اکیلا آدمی

اپنی تنہائی سے بھی ہوتی نہیں اب گفتگو
بیکراں قیدانا' اور میں اکیلا آدمی

میرا سایہ مر نہ جائے رات کے اس دشت میں
اتنا لمبا راستہ' اور میں اکیلا آدمی

اس کی رحمت کے ہزاروں در مگر وہ بے نیاز
میرے سو دستِ دعا اور میں اکیلا آدمی

درد کے الہام نازل ہو رہے ہیں دم بدم
دل کا یہ غارِ حرا اور میں اکیلا آدمی

مل کے حوا سے کیا آباد اسے میں نے قتیل
یہ جہاں میری عطا اور میں اکیلا آدمی

رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لئے پاؤں میں

ان کو بھی ہے کسی بھیگے ہوئے منظر کی تلاش
بوند تک بو نہ سکے جو کبھی صحراؤں میں

اے مرے ہمسفرو! تم بھی تھکے ہارے ہو
دھوپ کی تم تو ملاوٹ نہ کرو چھاؤں میں

جو بھی آتا ہے بتاتا ہے نیا کوئی علاج
بٹ نہ جائے ترا بیمار مسیحاؤں میں

حوصلہ کس میں ہے یوسفؑ کی خریداری کا
اب تو مہنگائی کے چرچے ہیں زلیخاؤں میں

جس برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
اس کو دفناؤ مرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں

وہ خدا ہے کسی ٹوٹے ہوئے دل میں ہو گا
مسجدوں میں اسے ڈھونڈو نہ کلیساؤں میں

ہم کو آپس میں محبت نہیں کرنے دیتے
اب یہی عیب ہے اس شہر کے داناؤں میں

مجھ سے کرتے ہیں قتیل اسلئے کچھ لوگ حسد
کیوں مرے شعر ہیں مقبول حسیناؤں میں

وہ دل ہی کیا ترے ملنے جو کی دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

رہے گا ساتھ ترا پیار زندگی بن کر!
یہ اور بات' مری زندگی وفا نہ کرے

یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں
خدا کسی سے کسی کو مگر جدا نہ کرے

سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے

بجھا دیا ہے نصیبوں نے میرے پیار کا چاند
کوئی دیا مری پلکوں پہ اب جلا نہ کرے

زمانہ دیکھ چکا ہے پرکھ چکا ہے اسے
قتیل جان سے جائے پر التجا نہ کرے

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

مل بھی لیتے ہیں، گلے وہ اپنے مطلب کے لئے
آ پڑے مشکل تو نظریں بھی چرا لیتے ہیں لوگ

خود فریبی کی انہیں عادت سی شاید پڑ گئی
ہر نئے رہزن کو سینے سے لگا لیتے ہیں لوگ

ہے بجا ان کی شکایت لیکن اس کا کیا علاج؟
بجلیاں خود اپنے گلشن پر گرا لیتے ہیں لوگ

ہو خوشی بھی ان کو حاصل، یہ ضروری تو نہیں
غم چھپانے کے لئے بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

اس قدر نفرت ہے ان کو تیرگی کے نام سے
روز روشن میں بھی اب شمعیں جلا لیتے ہیں لوگ

یہ بھی دیکھا ہے کہ جب آ جائے غیرت کا مقام
اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھا لیتے ہیں لوگ

روشنی ہے ان کا ایماں روک مت ان کو قتیلؔ
دل جلاتے ہیں یہ اپنا تیرا کیا لیتے ہیں لوگ

یا رب ساری جھیلوں کو آئینہ کر دے
یا پھر چاند ستاروں کو نابینا کر دے

ختم ہوا جاتا ہے سارا حسن غزل
آنکھوں کو ساغر جسموں کو مینا کر دے

جس پیشانی پر سورج نے دیا ہے بوسہ
اس پیشانی کا گلرنگ پسینہ کر دے

ہجر کا غم وہ جادو ہے پریت نگر کا
جو دن کو پھیلائے اور مہینہ کر دے

برسیں پھول تو دنیا حق جتلائے اپنا
تیر چلیں تو آگے میرا سینہ کر دے

جس نے ہجرت کی ہے نفرت کی نگری سے
میرے دل کو اس کے لئے مدینہ کر دے

باتیں بہت قتیل مگر اس ڈر سے چپ ہوں
یہ واعظ دشوار نہ میرا جینا کر دے

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے!
کہ سنگ تجھ پر گرے اور زخم آئے مجھے

میں اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں سائے کو
بدن مرا ہی سہی، دوپہر نہ بھائے مجھے

میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے

وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

برنگ عود ملے گی اسے مری خوشبو
وہ جب بھی چاہے بڑے شوق سے جلائے مجھے

زمانہ درد کے صحرا تک آج لے آیا
گزار کر تری زلفوں کے سائے سائے مجھے

میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیل
غمِ حیات سے کہہ دو خرید لائے مجھے

ہاتھ دیا اس نے مرے ہاتھ میں
میں تو ولی بن گیا اک رات میں

عشق کرو گے تو کماؤ گے نام
تہمتیں بٹتی نہیں خیرات میں

عشق بری شے سہی پر دوستو
دخل نہ دو تم مری ہر بات میں

مجھ پہ توجہ ہے سب آفات کی
کوئی کشش تو ہے مری ذات میں

راہنما تھا مرا اک سامری !
کھو گیا میں شہر طلسمات میں

راہنما تھا مرا اک سامری! کھو گیا میں شہر طلسمات میں

مجھ کو لگا عام سا اک آدمی!
آیا وہ جب کام کے اوقات میں

شام کی گل رنگ ہوا کیا چلی
درد مہکنے لگا جذبات میں

ہاتھ میں کاغذ کی لئے چھتریاں
گھر سے نہ نکلا کرو برسات میں

ربط بڑھایا نہ قتیل اس لئے
فرق تھا دونوں کے خیالات میں

جسے ہم صاف پہچانیں وہی منظر نہیں ملتا!
یہاں سائے تو ملتے ہیں کوئی پیکر نہیں ملتا

اسے پوچھے کوئی ایسی ملاقاتوں سے کیا حاصل
وہ ملتا ہے مگر درد آشنا بن کر نہیں ملتا

سنا ہے پایا جاتا تھا ہمیشہ میرے کاندھوں پر
مگر اب اس کے زانوں پر بھی میرا سر نہیں ملتا

ہمیشہ تازہ دم اس کے محلے تک پہنچتا ہوں
تھکن اس وقت ہوتی ہے وہ جب گھر پر نہیں ملتا

پرستش کی تمنا ہے مگر ہائے ری مجبوری
صنم جس سے تراشا جائے وہ پتھر نہیں ملتا

اسے معلوم ہے اس کا بدن سونے سے مہنگا ہے
جبھی تو وہ کبھی پہنے ہوئے زیور نہیں ملتا

قتیل اس شہر میں آخر بنائیں کس کو ہم اپنا
کہ لاکھوں مومنوں میں ایک بھی کافر نہیں ملتا

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو، بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے، پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا، بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے، تاروں نے بڑی دانائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا، کام آگئی دیوانگی اپنی!
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیلؔ اپنے مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

دنیا نے ہم پہ جب کوئی الزام رکھ دیا
ہم نے مقابل اس کے ترا نام رکھ دیا

اک خاص حد پہ آ گئی جب تیری بے رخی
نام اس کا ہم نے گردش ایام رکھ دیا

انسان اور دیکھے بغیر اس کو مان لے
اک خوف کا بشر نے خدا نام رکھ دیا

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرعام رکھ دیا

کیا مصلحت شناس تھا وہ آدمی' قتیل
مجبوریوں کا جس نے وفا نام رکھ دیا

تو نے یہ پھول جو زلفوں میں سجا رکھا ہے
اک دیا ہے جو اندھیروں میں جلا رکھا ہے

جیت لے جائے مجھے کوئی نصیبوں والا
زندگی نے مجھے داؤ یہ لگا رکھا ہے

جانے کب دل میں کوئی جھانکنے والا آ جائے
اس لئے میں نے گریبان کھلا رکھا ہے

امتحاں اور مرے ضبط کا تم کیا لو گے؟
میں نے دھڑکن کو بھی سینے میں چھپا رکھا ہے

دل تھا اک شعلہ، مگر بیت گئے دن وہ قتیل
اب کریدو نہ اسے راکھ میں کیا رکھا ہے

یارو کسی قاتل سے کبھی پیار نہ مانگو
اپنے ہی گلے کے لئے تلوار نہ مانگو

گر جاؤ گے تم اپنے مسیحا کی نظر سے
مر کر بھی علاج دل بیمار نہ مانگو

اس چیز کا کیا ذکر جو ممکن ہی نہیں ہے
صحرا میں کبھی سایہء دیوار نہ مانگو

کھل جائے گا اس طرح نگاہوں کا بھرم بھی
کانٹوں سے کبھی پھول کی مہکار نہ مانگو

یہ بھی ہے غنیمت جو ملے کوئی خریدار
بک جاؤ مگر قیمت ایثار نہ مانگو

دشمن نہیں کوئی دل بیدار سے بڑھ کر
قسام ازل سے دل بیدار نہ مانگو

ابھرے گا نہ دھڑکن سے قتیل اب کوئی نغمہ
ٹوٹی ہوئی پازیب سے جھنکار نہ مانگو

اے دل، اے دیوانے! تیری کوئی بھی دانائی، میرے کام نہ آئی
مان کے تیرا کہنا جھیلی میں نے جو رسوائی، میرے کام نہ آئی

خون پسینہ ایک بھی کر کے میں اور میرا تیشہ، پیاسے رہے ہمیشہ
پتھر کاٹ کے میں نے ابتک جو بھی نہر بنائی، میرے کام نہ آئی

روشنیوں کا غازہ مل کے بن گئے روشن تارے، مل کر جگنو سارے
اندھا تو میں نہیں تھا لیکن آج میری بینائی، میرے کام نہ آئی

مجھ پر میرے یاروں نے جتنا بھی پیار بکھیرا۔ چھایا اور اندھیرا
دل بجھنے کے بعد کسی نے جو شمع جلائی __ میرے کام نہ آئی

چڑھا ہوا بے چارگیوں کا مجھ پر خول نہیں تھا، میں کشکول نہیں تھا
عزت، دولت، پیار، مروت، کوئی چیز پرائی __ میرے کام نہ آئی

سوچا تھا اس محفل میں ہر کوئی ہے بیگانہ۔ کیا ان سے یارانہ
لیکن کیسا شکوہ ان کا، جب اپنی تنہائی، میرے کام نہ آئی

جس کی خاطر سب جنت سے ناتا میں نے توڑا۔ حوروں سے منہ موڑا
کیا بتلاؤں وہ عورت بھی یار قتیل شفائی-- میرے کام نہ آئی

رات کے سناٹے میں ہم نے کیا کیا دھوکے کھائے ہیں
اپنا ہی جب دل دھڑکا تو ہم سمجھے وہ آئے ہیں

چند جھروکے، سونی گلیاں، یا پھر غم کے سائے ہیں
چاند ستارے نکلے ہیں لیکن میرے لئے کیا لائے ہیں

جس دن سے تم بچھڑ گئے یہ حال ہے اپنی آنکھوں کا
جیسے دو بادل ساون کے آپس میں ٹکرائے ہیں

اب تو راہ نہ بھولو گے تم، اب تو ہم بے آن ملو!
دیکھو ہم نے پلک پلک پر سو سو دیپ جلائے ہیں

ہائے قتیل اس تنہائی میں کیا سوجھی ہے موسم کو
جس دن سے وہ پاس نہیں اس دن سے بادل چھائے ہیں

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں' اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفا کا' کوئی بھی معیار نہیں ہے

یہ بھی کوئی بات ہے آخر' دور ہی دور رہیں متوالے
ہرجائی ہے چاند کا جوبن' یا پنچھی کو پیار نہیں ہے

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں' یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

ملاحوں نے ساحل ساحل موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں ہے

قید قفس کے بعد کرے گا قید گلستاں کون گوارا؟
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں ہے

نامہ بر اپنا ہواؤں کو بنانے والے
اب نہ آئیں گے پلٹ کر کبھی جانے والے

کیا ملے گا تجھے بکھرے ہوئے خوابوں کے سوا
ریت پر چاند کی تصویر بنانے والے

میکدے بند ہوئے ڈھونڈ رہا ہوں تجھ کو
تو کہاں ہے مجھے آنکھوں سے پلانے والے

کاش لے جاتے کبھی مانگ کے آنکھیں میری
یہ مصور تری تصویر بنانے والے

تو اس انداز میں کچھ اور حسیں لگتا ہے
مجھ سے منہ پھیر کے غزلیں میری گانے والے

سب نے پہنا تھا بڑے شوق سے کاغذ کا لباس
جس قدر لوگ تھے بارش میں نہانے والے

چھت بنا دیتے ہیں اب ریت کی دیواروں پر
کتنے غافل ہیں نئے شہر بسانے والے

عدل کی تم نہ ہمیں آس دلاؤ کہ یہاں
قتل ہو جاتے ہیں زنجیر ہلانے والے

کس کو ہو گئی یہاں توفیق انا میرے بعد
کچھ تو سوچیں مجھے سولی پہ چڑھانے والے

مر گئے ہم تو یہ کتبے پہ لکھا جائے گا
سو گئے آپ زمانے کو جگانے والے

درو دیوار پہ حسرت سی برستی ہے قتیل
جانے کس دیس گئے پیار نبھانے والے

فکر تونسوی

مطربہ کا مطرب

قتیل شفائی ______ "مطربہ" کا مطرب ہے اور اس مطرب کو میں بیس سال سے جانتا ہوں۔

بیس سال پہلے وہ مجھے لاہور میں پہلی بار ملا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا شاعری کو "نان جویں" میں بدلا جا سکتا ہے؟"

اور بیس سال بعد وہ مجھے دہلی میں ملا، اس کے ہاتھ میں "مطربہ" تھی۔ جس پر سماج نے اسے پاکستان کا اہم ادبی انعام "آدم جی پرائز" عطا کیا تھا۔

وقت اور فاصلہ کی یہ منزلیں (کڑی اور جاں گسل) قتیل شفائی نے کیسے طے کیں، سماج کو اس نے کیوں کر تسلیم کرا دیا کہ تم جس کی نان جویں پر ناک بھوں چڑھاتے تھے وہ تو وقت کے باوقار ادبی انعام کا اہل تھا۔ وہ جس کا افلاس زدہ کرتا اور ناقابل یقین پائجامہ، وطن مقدس کی ناشاعرانہ سرد مہری کا غماز تھا۔ وہ تو سماج کی روح کا نباض تھا۔ تم جسے سمجھ نہ سکے لیکن تمہیں جو سمجھ گیا اور "مطربہ" لکھ کر ہماری روح پر پڑے ہوئے زرق برق اور چکا چوند، دبیز لباس کی تہیں جس نے یوں اتار دیں کہ تم کہہ اٹھے "قتیل! تم عظیم ہو، آؤ تمہیں گلے لگا لیں۔"

سماج نے قتیل کو اس وقت اعزاز بخشا جب اس نے سماج کے راز فاش کئے اور ہمارے سماج کا یہی مزاج ہے، یہی طبعی ٹریجڈی ہے کہ وہ توقیر کا ہار اسی کی گردن

میں ڈالتا ہے جو اس کے بھونڈے اور غلیظ نقش و نگار کی تصویر کھینچ دے ____ آرٹسٹ اور سماج کے درمیان یہ رشتہ بظاہر بڑا ہی افسوس ناک لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ سماج کو اسی قسم کا رشتہ مرغوب ہے کیوں کہ جب قتیل اپنے تخیل اور جذبہ کی پوری شدت کے ساتھ پیران شبستان طرب کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

رقص کرہاں رقص اس بہروپئے کے رو برو

عصمتیں لٹتی ہیں اب بھی جس کی عشرت گاہ میں
خوب صورت جسم بچھ جاتے ہیں جس کی راہ میں
خلوتوں میں جس کو ہے مرغوب شغل ناؤو نوش
مہرباں تجھ پر ہوا ہے آج وہ تربت فروش
تو اسی مجذوب کے آگے دما دم رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر

تو آرٹسٹ کے اس بپھرے ہوئے، زخمی لب و لہجہ پر سماج کے "تربت فروش" "مرحبا" کہہ اٹھتے ہیں۔ اور باہیں پھیلا کر آرٹسٹ کو مسند اعزاز پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسند اعزاز پر بیٹھ کر بھی قتیل انہیں تربت فروش کہنے سے باز نہیں آتا۔ کیوں کہ آرٹسٹ اپنے جذبات کا مول تول نہیں کر سکتا۔ (میرا مطلب صرف حقیقی آرٹسٹ سے ہے، غیر حقیقی آرٹسٹ اپنے اشعار کی تربت بنا کر بلا شبہ فروخت کر سکتے [illegible])

میں ایک بار پھر بیر[illegible] پہلے کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔

ان دنوں قتیل شفائی پٹھوں کے دیس صوبہ سرحد سے لاہور کے ادبی قلعے پر حملہ کرنے کے لئے وارد ہوا تھا ____ چوڑا چکلا سینہ، سرخ و سفید بیضوی چہرہ، گھنے گھنگھریالے بال، بھاری بھر کم پٹھانی خدوخال۔ اور اسے دیکھ کر ہم دھان پان قسم کے شہری لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی ابھی اپنے تھیلے سے پستے، بادام نکالے گا، اور

ممکن ہے سود کا کاروبار بھی شروع کر دے۔ اس کی کمر میں لمبے چغے کے نیچے چھپا ہوا چاقو بھی ہو گا۔ بچے اسے دیکھ کر سہم جائیں گے۔ بڑے اس سے کنی کترا کر نکلیں گے اور حسینائیں کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیں گی۔

لیکن ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب اس سرخ و سفید پٹھان نے اپنے جذبات انگیز ہاتھوں کی لرزش کے ساتھ تھیلے میں سے بادام اور پستے کی بجائے ایک غزل نکالی اور نہایت نرم و نازک اور نغمہ بار لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

تم اس کو برے نام سے یارو نہ پکارو
یہ نام اسے باعث آزار ہی کب تھا
ہم ڈوب گئے جاگتی راتوں کے بھنور میں
ہاتھ اس کا ہمارے لئے پتوار ہی کب تھا

تو بزرگان شعر و نغمہ نے ایک دم چونک کر اپنا سر اٹھایا اور قتیل شفائی کی طرف دیکھا' یہ پٹھان اور یہ درد و سوز! یہ چوڑا چکلا سینہ اور یہ لہجے کی رسیلی گھلاوٹ؟ یہ بھاری بھر کم کندھے اور یہ پیاری پیاری نرمی اور نغمگی؟ پٹھان کے اندر یہ شاعر کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ اس کے سود اور چاقو اور بزنس کیا ہوئے۔ یہ پٹھان تو بھنور میں پتوار پتوار پکارتا پھرتا ہے۔

چنانچہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے قتیل شفائی کی گونجیں پھیلتی گئیں' شعر و نغمہ کی محفلوں میں اس کی مخمور اور مخلص آوازیں تیرنے لگیں' اس کے احساس میں شوخی اور نزاکت تھی۔ اس کے الفاظ میں بے ساختگی اور بے تکلفی تھی۔ اس کے گلے میں ٹھہراؤ اور نغمگی تھی۔ افلاس زدہ قمیض کے اندر شعریت کا سرمایہ دار چھپا ہوا تھا۔ اس پر قتیل شفائی کے برتاؤ میں خلوص کی گرمی اور طبیعت کی سادگی نے قیامت ڈھا دی۔ شہر لاہور کے ادبی ماحول میں یہ خلوص اور سادگی قریب قریب نایاب چیز سمجھی جاتی تھی اور اسی لئے لاہور میں ہر نایاب چیز کو اجنبی سمجھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ اجنبیت اور نامانوسیت انہیں کھٹکتی رہی' لیکن قتیل شفائی معصوم بچوں کی سی

مقدس مسکراہٹ کے ساتھ کہتا رہا "اے شہر کے طرار باسیو! میں کوہ سلیمان کی پہاڑیوں سے تمہارے لئے یہ تحفہ لایا ہوں، اپنے آرٹ کو اس اجنبی شے کی "پٹھ" اور پھر دیکھو کہ آرٹ کی کوکھ سے کیسی خوب صورت چیز جنم لیتی ہے"

اور پھر بیس سال بعد ہم نے دیکھا کہ آرٹ کی کوکھ سے "مطربہ" نے جنم لیا۔ جس میں آرٹ کی شوخی بھی ہے اور تندی بھی ہے، اور خلوص اور سادگی کی نرمی اور گھلاوٹ بھی، معصوم اور مقدس قتیل شفائی جب شہر کی مکار اور پر تکلف اور جھوٹی محبت کے ساتھ ٹکرایا، تو اس تصادم سے "مطربہ" کا ظہور ہوا۔ مثبت اور منفی کے ٹکراؤ کا یہ کتنا خوب صورت نتیجہ ہے؟ جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔

قتیل شفائی نے "مطربہ" کیوں لکھی؟ کیسے لکھی؟ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ کہانی جو آپ بیتی ہے، کہانی جو جگ بیتی بھی ہے۔ شاعر نے نظموں کی اس کڑی کو غم ذات کی بھٹی میں پگھلا کر ڈھالا۔ اور جب یہ کڑی ڈھل کر نکلی تو غم ذات کی محدودیت سے نکل کر غم جہاں تک پھیلتی چلی گئی۔

اسی لئے اس کہانی کا ہیرو اگرچہ قتیل شفائی ہے، مگر قتیل شفائی کا تجربہ چونکہ ہم سب کا تجربہ ہے اس لئے ہم سب "مطربہ" کے ہیرو ہیں۔ قتیل شفائی تو ہم سب ہیروؤں کا ایک نمائندہ سمبل (علامت) ہے۔ آپ ان نظموں کو پڑھ کر دیکھیے تو آپ یہ محسوس کر کے متعجب ہوں گے کہ قتیل شفائی کے دل کی دھڑکنیں آپ کی دھڑکنیں ہیں سر، وہی تال، وہی آہنگ۔

مگر اس کہانی کی ہیروئن کون ہے؟

شاعر قتیل شفائی نے اس ہیروئن کا تعارف یوں کرایا ہے۔

سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
چھوڑ کے عصمت کی منڈی اور جسموں کا بازار
پیش کرے اونچے محلوں میں وہ فن کے شہ کار
زیب نہیں دیتا اب اس کو وہ گندا بیو پار
اوروں کی مانند بھلا کب ہوتی ہے نیلام

سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

اس تعارف میں تحسین کی بے ساختہ لہریں کیوں ابھر رہی ہیں؟ کیوں کہ شاعر ایک انوکھے تجربے سے دو چار ہونا چاہتا ہے۔ روایتی طوائف کو وہ فن کے شہ کار میں بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہے یا دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ اس تبدیلی میں ایک حسین خواب کی سی کیفیت ہے۔ اس لئے تحسین کا لہجہ اختیار کر کے وہ خواب کے حسن کو بچا بچا کر رکھنا چاہتا ہے اور اپنے ڈیفنس میں کسی فاتح کی طرح کہہ اٹھتا ہے۔

اپنے پیار سے میں نے اس کے بدل دیئے دن رات
دولت والے اسے خریدیں' کب ان کی اوقات
میری ہی چاہت کا لے گی اپنے سر الزام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

مگر اس کہانی کا ہیرو خالص "آدرش وادی" ہے۔ روایتی طوائف کو اپنے خلوص کے نغمے عطا کر کے وہ سمجھتا ہے کہ وہ اسے گندے بیوپار کی دل دل سے نکال کر فن کے بلند مینار پر بٹھا دے گا اور عشق کی بھرپور تابندگی سے اسے قابل بنا دے گا۔ اور پھر دنیا کو چیلنج دے گا کہ عشق کی معراج اور مینار کی بلندی سیم و زر کی کمندیں پھینک کر دکھاؤ! خطا کھاؤ گے۔

لیکن آدرش وادی کی کہانی جب تھوڑی سی آگے بڑھتی ہے تو پہلے حقیقت کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ٹکراتی ہے۔ کنکریوں کے بعد پتھر' پتھر کے بعد گڑھے' پھر چٹانیں اور پھر آدرش واد کا حقیقت کی سنگ دلی سے پے در پے تصادم ہونے لگتا ہے۔ اور تصادموں کی خوف ناک اور لرزہ خیز آوازیں "مطربہ" کی آدھی سے زیادہ نظموں میں سنائی دیتی ہیں اور شاعر چیختا ہے' چلاتا ہے تڑپتا ہے' پھڑکتا ہے' کہیں طعنے دیتا ہے' کہیں پیار سے سمجھاتا ہے۔ کہیں اپنی محبت کا واسطہ دیتا ہے' کہیں ماضی کے گیتوں بھرے لمحات کی سوگند دیتا ہے' ڈراتا ہے' مشتعل ہوتا ہے' کبھی کبھی صداقت کے اتنے نزدیک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے خلوص اور محبت اور آدرش پر خفیف ہو جاتا

ہے۔ منہ چھپا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک آدھ بار تو حقیقت کے ہاتھوں پاش پاش ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور پھر بدستور کبھی موہوم امید کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے۔

آدرش داد کی شکست کی سینکڑوں کیفیتیں "مطربہ" کی نظموں میں پورے زور اور پوری تندی کے ساتھ موجود ہیں۔ کیوں کہ یہی کیفیتیں ہی اس کہانی کا حاصل ہیں۔ ٹوٹتے ہوئے خواب اور ابھرتی ہوئی حقیقت کے یہ درمیانی لمحے' ایک پوری داستان' جو غم ذات کو غم جہاں میں ڈھالنے کا عمل ہیں کیونکہ وہ روایتی طوائف جسے شاعر نے گندے بیوپار سے اٹھا کر سیم و زر کی طاقتور اور ہوسناک آغوش سے چھپا کر اپنے گیتوں کے شیش محل میں لا بٹھایا تھا۔ اس کے گھنگھرو پھر رہزنوں کے زرق برق قالینوں پر تھرکنے لگے تھے۔

اور شاعر "آدرش دادی" ہیرو کا خواب ٹوٹ جاتا۔
سماج پر پیسے کی حکمرانی ہے' وفا کی نہیں۔
پیسے کی حکمرانی میں جسم ہی نہیں بکتے' نغمے بھی بکتے ہیں۔
اور شاعر اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے رو اٹھتا ہے اور کہتا ہے۔

تیرے اسلاف نے کھولی تھی جو نغموں کی دوکاں
اس میں ایک شاعر نادار کی توقیر کہاں
یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے میری زباں

"مطربہ" کی کہانی ایک آدرش دادی کی فتح اور ایک حقیقت پسند کی شکست کی کہانی ہے۔ اور یہی اس کہانی کا حسن ہے کہ اس میں ایک ہی فرد بیک وقت آدرش دادی بھی ہے اور حقیقت پسند بھی۔ وہ جیتتا بھی ہے اور ہارتا بھی۔ جیت اور ہار کا یہ سنگم اس کہانی کو ایک مکمل حسن عطا کرتا ہے' دونوں کیفیتوں کے ایسے دلاویز تجربے اس میں موجود ہیں' جو شاید اور کسی شاعر نے آج تک اس گوناگوں تکملیت سے ساتھ بیان نہیں کئے۔ جیت اور ہار کے اس اتار چڑھاؤ میں جتنے بھی نمائندہ کردار ممکن تھے قتیل شفائی نے اپنے فن کے البیلے اور تند دونوں اسالیب کے ساتھ بڑے

تاثر انگیز لہجہ میں پیش کر دیئے ہیں۔ اس نے کچھ نہیں چھپایا' سب کچھ بتا دیا۔ تبسم' چیلنج' سنبھالا' امید' جدوجہد' طنز' اداسی' بے بسی' کرب' ______ ہر شمع اس نے اپنے احساسات کی آگ سے جلائی اور وقت کے ایک بہت بڑے ______ یعنی طوائف کے مسئلے کے اردگرد روشنی کے ہالے پھیلا دیئے۔

اور یہی آرٹ کی صداقت ہے۔

اور اسی لئے "مطربہ" ایک بلند پایہ اور لافانی تخلیق ہے۔

لیکن "مطربہ" کی یہ پوری شاعرانہ کہانی پڑھنے کے بعد میرے دماغ میں ایک سوال بار بار گونجتا رہا کہ اس رومانٹک حقیقت پرست شاعر کے اس عظیم تجربہ کا حاصل کیا ہے۔؟

طوائفیت ______ ایک قدیم ترین انسٹی ٹیوشن ہے' بلکہ ایک زمانہ میں تو یہ ادارہ سماج کی تہذیب کا ایک ممتاز حصہ بن گیا تھا۔ سماج کے حکمراں طبقہ نے اسے سماجی تہذیب میں شامل کر کے اس ادارہ کے منفی کردار کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا' تاکہ طوائفیت پر بد اخلاقی کا لیبل چسپاں نہ ہو سکے۔ کیوں کہ یہ ادارہ اونچے طبقہ کے لئے سامان عیش و تفنن مہیا کرتا تھا۔ مگر سماج کی مروجہ اخلاقی قدریں اس سامان عیش کے راستے میں حائل تھیں' للذا اونچے طبقہ کے سامنے رکاوٹ دور کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ طوائفیت کو بھی اخلاق اور تہذیب کی مقدس صفوں میں شامل کر لیا جائے اور اسے آرٹ اور موسیقی اور کلچر کا شوخ وشنگ رنگ عطا کر دیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد طوائفیت کی انسٹی ٹیوشن دو حصوں میں منقسم ہو گئی ایک حصہ پر بداخلاقی کا لیبل چپکا دیا گیا' اور اسے نچلے طبقے کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اور دوسرے حصہ کو تہذیب اور آرٹ کی صف میں لے جایا گیا اور وہ اونچے طبقہ کی "فن پرستی" کے سایہء عاطفت میں پرورش پاتا رہا۔

اور اس میں طوائف کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ طوائفیت کا جنم داتا یہی اونچا طبقہ ہے۔ اسی کے سماجی نظام کی غلاظتوں' خامیوں اور تاریکیوں میں سے طوائف پیدا ہوئی ہے۔ اور یہی اونچا طبقہ ہی سماج کو دھوکا دینے کے لئے کبھی کبھار اس انسٹی

ٹیوشن کے خلاف نعرے بھی لگاتے دیکھا گیا ہے۔

قتیل شفائی کی "مطربہ" اسی اونچے طبقہ کے سماجی نظام کی پیداوار ہے اور طوائفیت کی انسٹی ٹیوشن کے جن دو حصوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ان دونوں کے درمیان ایک بے گھر طائر کی طرح بھٹکتی پھرتی ہے۔ وہ پہلے نچلے طبقہ کے لئے مخصوص تھی، اس پر بد اخلاقی کا لیبل چپکا ہوا تھا، مطربہ کے ہیرو نے اسے اٹھا کر تہذیب اور آرٹ کی صف میں لے جانا چاہا۔ اور اپنی "فن پرستی" کے سائے میں اس کی پرورش کرنے لگا۔ مگر مطربہ ایک دم اس کے ہاتھ سے مچھلی کی طرح نکل گئی اور اونچے طبقہ کی آغوش میں جا گری اور اونچے طبقہ کے لئے سامان عیش و تفنن کا ذریعہ بن گئی۔

"مطربہ" کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ "مطربہ" کے ہیرو کی ٹریجڈی ہے کہ اس نے اپنی ہیروئن کو ممتاز مقام دینے کیلئے بڑی ٹیکنیک اختیار کی، جو اونچے طبقہ نے اپنے مقاصد کے لئے ایجاد کی تھی۔ قتیل شفائی نے پیمانہ تو اونچے طبقہ سے لیا اور پرکھا اسے اپنے پیمانہ پر، نتیجے کی ٹریجڈی ہمارے سامنے ہے کہ اونچے طبقے والے اس کی ہیروئن کو چھین کے لے گئے اور قتیل شفائی کے لئے صرف شاعرانہ احتجاج چھوڑ گئے۔

اور یوں طوائفیت کا مسئلہ جوں کا توں قائم رہا۔

اس لئے وہ سماجی نظام جس نے طوائف کو جنم دیا جس کے لئے اس نے دو حصے بنائے، جس کے پاس اخلاق اور تہذیب کے اپنے مقصدی پیمانے ہیں اور جس کے پاس سیم و زر کی طاقت ہے وہ صرف "مطربہ" کے ٹریجک ہیرو کے عشق صادق، خلوص، فن، سپردگی اور خوبصورتی کی طاقت سے شکست نہیں کھا سکتا۔ "مطربہ" کی نظموں کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس سماجی نظام کو بدلے بغیر طوائف کو بدلا نہیں جا سکتا۔

ہاں قتیل شفائی کی "مطربہ" کا تجربہ ایک ٹریجڈی ہے۔ اور یہ نظمیں اس ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدل دینے کا ایک تاریخی مطالبہ بن کر آپ کے سامنے آئی

ہیں- اور یہی مطالبہ اس کا حاصل ہے-

اور قتیل شفائی خود بھی اس کا اعتراف کرتا ہے-

ابراہیم جلیس (مرحوم)

عوامی شاعر قتیل شفائی

پچھلی دو صدیوں کے دوران ارض ہمالہ پر دو مشہور "اورنگ زیب" پیدا ہوئے۔ ایک اورنگ زیب نے شہنشاہ عالمگیر بن کر اپنی تلوار کے ذریعہ جہیل ڈل سے لے کر راس کماری تک سارا ارض ہمالہ فتح کیا تھا تو دوسرے اورنگ زیب نے شاعر قتیل شفائی کا روپ دھار کر اپنے قلم کے ذریعے ارض ہمالہ پر آباد دنیائے شعرو ادب کو مسخر کر لیا۔

میں نے یہاں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ اورنگ زیب قتیل شفائی کا اس لئے نام لیا ہے کہ میری اپنی نظر میں قتیل شفائی بھی بڑا ہمالہ شاہ آدمی ہے۔ اس کے سوا اورنگ زیب عالمگیر اور اورنگ زیب قلم درانگشت۔۔۔وہ اورنگ زیب قرآن مجید کا کاتب' یہ اورنگ زیب کلام قتیل شفائی کا مصنف...... وہ حافظ قرآن' یہ صاحب دیوان .... اس کی لمبی داڑھی اس کا منہ صفاچٹ .... وہ خلعت ہفت پارچہ میں ملبوس اور یہ سوٹڈ بوٹڈ .... اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں پہلے اورنگ زیب کو یہیں رخصت کر کے دوسرے اورنگ زیب کے ساتھ آپ کی طرف آؤں۔

آپ دوسرے اورنگ زیب کو نہیں جانتے' میں بھی نہیں جانتا' یا اگر جانتا ہوں تو بڑا واجبی سا____ البتہ قتیل شفائی کو آپ بھی جانتے ہیں' میں بھی جانتا ہوں۔ اور پاکستان اور ہندوستان کا ہر وہ شخص جانتا ہے جو تھوڑی بہت اردو زبان جانتا ہو پاکستانی فلمیں دیکھتا ہو' قتیل شفائی دراصل اورنگ زیب ثانی کی ایک ارتقائی شخصیت ہے۔

قتیل شفائی اپنے ہمزاد اورنگ زیب سے کب آخری بار رخصت ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن قتیل نے اپنے ہمزاد اورنگ زیب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قتیل شفائی کا بچپن اور لڑکپن تھا۔ اس کے بعد جب شباب آیا تو اورنگ زیب نہیں بلکہ قتیل شفائی کا نام لے کر آیا۔ اب ہمالہ کے دامن میں آباد پٹھانوں کی ایک بستی ہری پور ہزارہ کے چند لوگ اس اورنگ زیب کو جانتے ہوں تو جانتے ہوں یا ہری پور ہزارہ کے اسکول کے رجسٹروں میں یا پھر قتیل کے قریبی رشتہ داروں کی زبان پر اورنگ زیب کا نام شاید ابھی موجود ہو------ ویسے اورنگ زیب اب کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے آپ کو قتیل شفائی میں ڈھالنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا اور اب ہمیشہ کے لئے قتیل شفائی کی جون میں چھپ کے رہ گیا ہے۔

قتیل شفائی چونکہ میرا دوست، ہم سفر، ہم جنس، ہم عصر، ہم مشرب، ہم پیشہ اور ہم جلیس ہے اس لئے اس نے مجھے کبھی کبھار اورنگ زیب کی باتیں بھی بڑے مزے لے لے کر سنائی ہیں اور میں نے باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا لیا ہے کہ اورنگ زیب کس طرح قتیل شفائی بنا ہے۔ اس تبدیلی کا عمل تقریباً" وہی ہے جو پانی کے قطرے کو گہر بنا دیتا ہے۔ اب یوں سمجھئے کہ اگر اورنگ زیب ایک شخص تھا تو قتیل شفائی ایک شخصیت ہے۔

قتیل نے مجھے بتایا کہ اورنگ زیب تقریباً" تیس سال پہلے ہری پور ہزارہ کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی پہلی اولاد جس لاڈ پیار اور جس ناز نعم سے پالی جاتی ہے---- اورنگ زیب کو بھی ماں باپ کا وہی لاڈ پیار ملا۔ اچھے ماں باپ، اچھا گھر، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھی تربیت اور اچھا ماحول------ ان ساری اچھائیوں نے ننھے اورنگ زیب پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ چنانچہ گھر ہو یا اسکول ہر جگہ لوگ بڑے پیار سے یہی کہتے تھے کہ اورنگ زیب بڑا اچھا لڑکا ہے---- لوگ آجکل قتیل شفائی سے ملنے کے بعد پہلا تاثر یہی قائم کرتے ہیں کہ قتیل نہ صرف شاعر اچھا ہے بلکہ آدمی بھی اچھا ہے' یہ اچھائی دراصل اسے ماں باپ کے خون کے ذریعے ورثہ میں ملی ہے اور اس کو اورنگ زیب نے بیس برس تک اپنے پاس امانت کے طور

پر رکھا اور پھر جب قتیل شفائی صرف شعر گوئی کی صلاحیت لے کر اورنگ زیب سے ملا تو اورنگ زیب کو قتیل شفائی کی بے مائیگی پر ترس آیا اور اس نے اپنی ساری اچھائیاں قتیل شفائی کے حوالے کر دیں، یہی وجہ ہے کہ عام شاعروں کی طرح ہم قتیل کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ۔

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

قتیل کے آبائی نام اور اس کے وطن کو دیکھ کر بچپن میں قتیل کے والد کے دوست یہی اندازہ لگاتے ہوں گے کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح ملازموں سے پاؤں دبوانے، حقہ پینے اور اپنی طرح کے "اورنگ زیب" پیدا کر کے گزارے گا اور ہری پور ہزارے کے باہر کسی کو بھی پتہ نہ چلے گا کہ کوئی اورنگ زیب پھر اس دنیا میں آیا تھا۔ قتیل شفائی میں شعر گوئی کا ذوق کب پیدا ہوا، اس نے پہلا شعر کب کہا، وہ شعر کیا تھا کیسا تھا یہ اب شاید قتیل کو بھی یاد نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ مجھے جب ملا تو وہ اس وقت ایک بھرپور شاعر تھا اور ایک مشہور شاعر تھا۔

قتیل سے ملنے سے پہلے میں نے قتیل کی آواز سنی اس کی آواز اتنی میٹھی اور اتنی رسیلی تھی کہ میں بے قرار ہو گیا کہ میں نے رسالہ "سویرا" لاہور کے موجودالوقت مدیر ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ کل رات میں نے راولپنڈی کے ایک سینما گھر سے ریلے ہونے والے مشاعرہ میں گاندھی جی کے قتل کے عنوان سے قتیل شفائی کی مترنم نظم سنی ہے، اس کی آواز اور اس کا کلام سن کر میں اس کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیسا شاعر ہے یہ! قتل بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی شفا بھی عطا کرتا ہے۔ ساحر لدھیانوی کا جواب آیا کہ تم نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل صحیح ہے، وہ جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا انسان بھی ہے ــــــ ساحر کی اس رائے نے قتیل سے ملنے کی خواہش کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ ان دنوں قتیل شفائی لاہور میں تھا اور میں اس سے کوئی پندرہ سو میل دور حیدر آباد دکن میں ــــــ اس لئے یہ آگ کئی برس تک جلتی رہی۔ عرصہ گزر گیا، پھر میں مہاجر بن کر لاہور پہنچا ــــــ لاہور پہنچنے کے دوسرے دن یا تیسرے دن میں

حضرت احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ لاہور کے یارانِ ترقی پسند کی ایک بیٹھک "پیراڈائز ریسٹوران" سے باہر نکل رہا تھا کہ قاسمی صاحب نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں پوچھا۔

قتیل شفائی سے ملے ہو؟

میں نے تڑپ کر کہا۔۔۔۔۔۔۔

نہیں کہاں ہے وہ! میں تو کب سے اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کیلئے بیقرار ہوں۔

قاسمی صاحب نے کہا۔۔۔۔۔۔۔

تو پھر آؤ۔۔۔۔۔۔

ایک ہی لمحے بعد اپنے آگے ایک سرشار :ران میں نے کھڑا پایا تھا' اور وہ تھا قتیل شفائی ـــــ گیبرڈین کے ویل پر ـسڈ سوٹ، اور ٹوئل کی بیش قیمت نکٹائی میں ملبوس گندمی رنگ' بھرے بھرے چہرے' چمک دار پیشانی' چمک دار آنکھوں' چمک دار گالوں والا متوسط قد کاٹھ والا بھرپور طور پر صحت مند قتیل شفائی اس قتیل شفائی سے بالکل مختلف تھا جس کا ہیولیٰ میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔ قتیل سے ملنے سے پہلے اور اس کے پرانے طرز کے ثقیل قسم کے تخلص کو ذہن میں رکھنے سے میرے تصور میں قتیل کا وہی ہیولیٰ بنا تھا' جیسا کہ بالعموم پرانے روایتی شاعروں کا ہوتا ہے یعنی دھان پان جسم' اس پر جھولتی ہوئی میلی سیاہ اچکن' پچکے ہوئے گالوں میں دبا ہوا پان کا بیڑا' آنکھوں پر دھرتے تالے والی عینک' سر پر خشک لمبے لمبے بال' ٹانگوں میں علی گڑھی فیشن کا پاجاما اور پیروں میں آپاشاہی جوتی' دن بھر آنکھوں سے چیپڑ پونچھنے والا سرِشام ہی سے ٹھرا نوشی کا آغاز کر کے نصف شب کے قریب مدہوش ہو کر کسی گندی نالی میں پڑے رہنے والا شاعر ـــــ لیکن قتیل اپنے دقیانوسی تخلص کے بالکل برعکس بڑا کھلے ڈھلے والا اور نہایت جامہ زیب شخص ہے' غزل گوئی کے ساتھ ساتھ وہ جتنا نظم گو شاعر ہے اس کی زندگی میں بھی ویسا ہی نظم و ضبط ہے' جس طرح فیض دیکھنے میں شاعر کے بجائے ایم اے کا طالب علم' فلموں کا ہیرو یا سول سروس کا کوئی اعلیٰ افسر معلوم ہوتا ہے' اسی طرح اس کا گھر بھی شاعر کا کلبئہ تاریک نہیں

ہے۔ لاہور کے ایک نواحی محلے مصری شاہ میں چٹی میت (سفید مسجد) سے قریب رحیم پارک کے علاقے میں جدید ترین فرنیچر اور رنگ برنگے حریری پردوں سے سر سراتا ایک پختہ مکان ہے جس میں قتیل شفائی اپنی ایک عدد بیوی اور چار خوب رو بچوں کے ساتھ ایک کھاتی پیتی زندگی کے ساتھ فلرٹ Flirt کر رہا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ کھاتی پیتی زندگی قتیل کو اس کے خوش حال باپ سے ورثے میں ملی ہے بلکہ وہ اپنے باپ سے ملی ہوئی جائیداد اور ذاتی مکان کو اپنے اقرباء کے حوالے کر کے عرصہ ہوا ہری پور ہزارہ کو خیرباد کہہ آیا تھا اور اپنی زندگی کے فردوس کی آپ اپنے ہاتھوں تعمیر کے لیے تقریباً" خالی ہاتھوں اور خالی جیبوں کے ساتھ لاہور آیا تھا۔

اس سماج میں ایک شاعر کی زندگی کیا ہوتی ہے' ملک کے خزانے میں شاعر کا کیا حصہ ہوتا ہے! شعر کہنا بھوکے رہنا' یا شعر کہنا اور مانگے تانگے کی زندگی بسر کرنا' شاعر کو ہمارے سماج میں واہ واتو بہت ملتی ہے' لیکن یہ واہ وا نہ کبھی چاندی کے سکوں میں ڈھل سکتی ہے اور نہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکتی ہے! مگر قتیل نے (جو بڑا سرگشتہ خمار رسوم و قیود ہے) یہ عزم کیا کہ وہ اپنی شاعری کو اس طرح پیش کرے گا کہ واہ وا صرف آواز ہی نہ رہ سکے بلکہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکے اور چاندی کے سکے میں ڈھل جائے۔ قتیل پٹھان ہونے کی وجہ سے دھن کا بڑا پکا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی جدوجہد اور اپنے وجود سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو زبان کا شاعر محض اپنی قوت شعر گوئی سے بھی ایک بڑی با عزت اور خوش حال زندگی کی تخلیق کر سکتا ہے۔

سردیوں میں ٹویڈ' گیبرڈین پک اینڈ پک وغیرہ کے بیش قیمت سوٹ اور شیروانیاں پہننے والا اور گرمیوں میں ہر روز ململ کا سفید براق کرتہ اور اجلا پاجامہ اور ہلکی سی چپل پہننے والا صاف ستھرا قتیل شفائی بقول خود اس خوش لباسی کو اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ خول صاف ستھرا ہو تو روح بھی صاف ستھری رہتی ہے۔ چنانچہ قتیل کی شاعری میں جو پاکیزگی' نفاست اور اجلا پن نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ دراصل اس کی اپنی نفاست طبع کی پیداوار ہے' جس زمانے میں قتیل اپنے شعر سنانے کے لئے پہلی بار دنیا کے سامنے آیا اس زمانے میں شاعر کی روایات کچھ عجیب سی تھیں۔ یعنی شاعر

وہ ہے جو بے حد شراب پیئے۔ جو بادہ خوار نہیں وہ شاعر نہیں' زندگی کے راستے پر شاعر ہمیشہ لڑکھڑاتا چلے سیدھا نہ چلے' تاکہ لوگ آسانی سے پہچان لیں کہ دیکھو دیکھو وہ شاعر جا رہا ہے۔ ان دنوں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی' جگر مراد آبادی (سابق) اسرار الحق مجاز اور عبدالحمید عدم کی بادہ خواری الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح مشہور تھی۔ نو عمر شاعروں پر اس کا بڑا برا ہی اثر پڑ رہا تھا۔ ہر نو عمر شاعر ان بڑے شاعروں کی تقلید میں ان کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے چلنے میں بڑا فخر محسوس کرنے لگا تھا مگر روایات کا باغی بتوں کو نہ ماننے والا اور اپنے آپ پر پورا اعتماد رکھنے والا قتیل شفائی اس راستے پر چلنے کے لئے قطعاً" تیار نہیں تھا وہ اس دنیا کو اور انسان کی زندگی کو براہ راست اور بہ قائمی ہوش و حواس دیکھنا چاہتا تھا وہ شعروں کے پھول اور بیل بوٹے اگانے کے لئے شرابیاری کا قائل نہیں تھا' اس نے کبھی ابتدا ہی میں غیر شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شعر قتیل کے گا شراب نہیں' میں یہ نہیں کہتا کہ قتیل شراب نہیں پیتا ____ وہ شراب پینے کو برا بھی نہیں سمجھتا لیکن وہ اسی طرح شراب پیتا ہے جیسے کوئی سدا گیروے رنگ کے کپڑے پہننے والا سادھو تنہائی میں دنیا کی نظروں سے چھپ کر رنگ برنگے بھڑکیلے کپڑے پہنے' آئینے میں اپنے آپ کو دیکھے' مسکرائے اور پھر چپکے سے انہیں اتار کر چھپا کر رکھ دے۔

کبھی کبھی جب آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوں اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو یا عید شب برات کی شام ہو یا نہایت بے تکلف دوستوں کا مجمع ہو تو قتیل چپکے سے تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ نمودار ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں اس سکاٹ لینڈ کی کوئی بڑھیا قسم کی وہسکی کی ایک دل آویز بوتل ہوتی ہے' پھر جام رقصاں ہوتے ہیں۔ پھر مے چھلکتی ہے' پھر قتیل پیتا ہے ____ لیکن اتنی ہی پیتا ہے کہ وہ سرور کی حد سے آگے نہ جائے اور نشے کی حد سے دور ہی رہے۔ قتیل کے بلا نوش دوست اسے کم ظرف کہتے ہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کم ظرف نہیں "نوش ظرف" ہے۔ وہ روز نہیں پیتا' زیادہ نہیں پیتا اور اپنے کو برا نہیں سمجھتا' اس لئے میری یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ اختر شیرانی' منٹو اور مجاز کی طرح "غرق مے ناب"

نہیں ہو گا بلکہ اس کی موت ایک صحت مند زندگی کے طبعی اختتام کی طرح آئے گی۔

ان دنوں میرے شب و روز کا بیشتر حصہ قتیل کے ساتھ گزرتا ہے اور میں قتیل کا بڑا گہرا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے' کھاتے پیتے' لکھتے پڑھتے' سوتے جاگتے قتیل شفائی کو میں غور سے دیکھتا رہتا ہوں ______ اور حاصل مطالعہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو عام آدمی کی طرح نہیں بسر کرتا بلکہ وہ زندگی ایک بہت بڑی ذمہ داری سمجھتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے لمحے لمحے کا رس نچوڑے' ایک لمحہ بھی بیکار نہ جانے پائے۔ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا یہ قتیل کا وطیرہ نہیں بلکہ وہ روز و شب سے ان کی ساری لذتیں کشید کرنے کو "زندگی گزارنے" کا نام دیتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑا سحر خیز ہے' گرمی ہو یا سردی ہر صبح تازہ ٹھنڈے پانی کے غسل کے بعد دو مکھن لگے توس دو فرائی انڈے تھوڑا سا شہد اور پاؤ بھر دودھ پر مشتمل ناشتے کے بعد وہ ضروری خطوط لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے ادھر نو بجتے ہیں ادھر قتیل گھر سے نکلتا ہے اور سہ پہر تک فلم کمپنیوں' اخباروں اور ناشران کتب کے دفتروں میں اپنے افکار کی سودا بازی میں مصروف رہتا ہے شام ہوتی ہے تو وہ اپنے چند منتخب دوستوں کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ رومانی اور تاریخی سڑک مال روڈ پر ٹہلتا ہوا لارنس باغ کا ایک چکر لگا کر ساڑھے آٹھ نو بجے تک ایک شریف گھریلو آدمی کی طرح گھر پہنچ جاتا ہے' بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف محسوس کرتا ہے۔ طبیعت شعر گوئی پر آمادہ ہو تو اس وقت تک جاگتا رہتا ہے' جب تک رات کی زلفیں بکھر کر کمر تک یا اس سے بھی نیچے نہ لہرا جائیں۔ اگر طبیعت موزوں نہیں ہے تو پھر دس گیارہ بجے کے درمیان کسی لمحے نیند کی پری آتی ہے اور قتیل کو ساتھ لے کر خوابوں کے جزیرے میں چلی جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرا تجزیہ غلط ہو لیکن جب بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ قتیل کی شاعری میں اتنی مٹھاس کیوں ہے تو معاً میرا ذہن' برفی' گلاب جامن اور موتی چور کے لڈوؤں یا زردے کی طرف چلا جاتا ہے۔ قتیل اپنی میٹھی طبیعت کے لحاظ سے میٹھے کا بڑا دلدادہ ہے' ہر کھانے کے بعد ایک سوئٹ ڈش اس کیلئے ایک لازمہ ہے۔ کبھی

کبھی دفتروں میں جب ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں تو قتیل کھانے کے بعد بالتزام اٹھنی کی برفی ضرور منگاتا ہے۔ شرینی کے اس شوق نے بلا شبہ قتیل کو بڑا شریں ذہن، شیرین زبان اور شیریں بیان شاعر بنانے میں بڑی مدد دی ہے (میں پھر کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے میرا تجزیہ غلط ہو)

جس طرح قتیل کی شاعری میں جدید اور قدیم شاعری کا ایک حسین امتزاج ہے اسی طرح اس کی شخصیت میں بھی جدید اور قدیم تہذیب کی مناسب مناسب آمیزش ہے، وہ مغربی تہذیب کو بھی پسند کرتا ہے اور مشرقی تہذیب کے اچھے اصولوں سے بھی کنارہ کش نہیں ـــــ دوستوں میں وہ احمد ندیم قاسمی کا بڑا احترام کرتا ہے، حالانکہ قتیل، قاسمی صاحب سے بے حد بے تکلف ہے لیکن اس پر مشرقی اخلاق کا اس قدر گہرا اثر ہے کہ وہ قاسمی صاحب کی موجودگی میں آپ کو چند خاص حدوں میں محصور کر لیتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بزرگوں کے اس روائتی احترام نے قتیل میں کبھی کوئی احساس کمتری نہیں پیدا ہونے دیا۔ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی محفل ہو یا پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت مشاعرہ، اخبار کا دفتر ہو یا فلم کمپنی کا دفتر ـــــ قتیل جہاں بھی پہنچتا ہے اور جہاں بھی بات کرتا ہے، اس میں بڑا دبنگ پن ہوتا ہے۔ جیسے اس کا وجود کہہ رہا ہو کہ کوئی بات نہیں، آپ کوئی بھی ہوں آخر میں بھی تو قتیل شفائی ہوں۔

قتیل اپنی قسمت آپ پہچانتا ہے اس نے کسی موقع پر بھی اپنے آپ کو ارزاں نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں وہ فلموں کے لئے گیت لکھتا ہے، پاکستان کی فلمی صنعت نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ فلمی شاعر کو ایک گیت کا معاوضہ زیادہ سو روپے دے سکے لیکن قتیل وہ شاعر ہے جو فلمی صنعت کی اس زبوں حالی کے باوجود ایک گیت کا کم سے کم معاوضہ ساڑھے تین سو روپے لیتا ہے، ویسے اس نے ایک ایک گیت چار چار سو اور پانچ پانچ سو روپیہ میں بھی لکھا ہے۔ پاکستان کے فلم ساز قتیل سے اس کے مہنگے گیت اس لئے خریدنے پر مجبور ہیں کہ جن فلموں میں اس کے گیت ہوتے ہیں کم از

کم سلور جوبلی فلم ضرور ہوتی ہے' ویسے ثبوت پیش کرنے کا تکلف بیکار ہے اس لئے کہ قتیل کا صرف ایک ہی گیت ہے۔

الفت کی نئی منزل کو چلا............

دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

آج درہ خیبر سے سندر ابن تک اور جھیل ڈل سے راس کماری تک گونج رہا ہے۔

قتیل علم کی دنیا سے قلم کی دنیا میں اس لئے داخل ہوا کہ علم کی دنیا میں قتیل کا ایک مجموعہ کلام جو اوسطاً" سو غزلوں' نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ (بظاہر ایک ہزار تعداد والی ایک اشاعت جو شاعر کے مرنے تک ایک ہزار سے زیادہ فروخت نہیں ہوتی البتہ بیس ہزار گھروں کی کتابوں کی الماریوں میں ضرور پائی جاتی ہے) چار پانچ سو روپیہ حاصل کر لیتا ہے۔ قتیل شاعر کے علاوہ ایک کنبے کا صدر خاندان' اپنی بیوی کا شوہر' اپنے بچوں پرویز' مسرت' تنویر اور ثمینہ کا باپ اور اپنی بوڑھی والدہ کا کفیل ہے اور وہ صرف علمی دنیا کا شاعر بن کر زندگی کی اس گاڑی کو نہیں کھینچ سکتا جس میں اتنے سارے افراد سوار ہیں' اس لئے وہ علم کی دنیا سے قلم کی دنیا اور قلم کی دنیا سے علم کی دنیا میں صبح سے شام تک محنت میں مصروف رہتا ہے۔ کہ وہ جتنا خود دار ہے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی زندگی بھی اتنی ہی خود دار ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کو اس کے اہل و عیال کے لئے کوئی قتیل فنڈ نہ جاری کرنا پڑے یا اس کی بیوی بچے حکومت کے وظیفے کے محتاج ہوں۔

قتیل جن دنوں چنگی کے محکمے میں کلرک تھا۔ لاہور کے فلمی رسالوں اداکار اور اجالا کا ایڈیٹر تھا اور مشہور ترقی پسند جریدے ادب لطیف کا مدیر تھا ان دنوں اس کی زندگی مالی اعتبار سے اچھی یا خوش گذران نہیں تھی لیکن بچے تلے منصوبوں کے تحت زندگی بسر کرنے والے قتیل کو یقین تھا کہ وہ ایک دن خود اپنے ہاتھوں اسی زمین پر اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا خوبصورت فردوس تعمیر کرے گا۔ چنانچہ وہ اس فردوس کی بڑی حد تک تعمیر مکمل کر چکا ہے۔

قتیل میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن چونکہ ان خامیوں نے قتیل کو شخص سے

شخصیت بننے میں کوئی مدد نہیں دی ہے، اس لئے ان کا تذکرہ ہی بیکار ہے اور اب جب کہ وہ شخص سے شخصیت بن چکا ہے تو ہمیں اور آپکو اس کی خامیاں بھی اچھائیاں نظر آنے لگی ہیں۔ بعض دوست جو قتیل کی زندگی میں صرف خامیاں تلاش کرنا چاہتے ہیں وہ صرف ایک عورت تک پہنچ سکے ہیں وہ عورت (جو ابھی بقید حیات ہے) جوانی کے راستے پر قتیل کی پہلی لغزش ہے اور شاید آخری بھی، اب بھی کبھی کبھی قتیل کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھئے تو اس کے تصور کی چلمن کے پیچھے ایک سایہ سا ضرور نظر آتا ہے۔ وہ آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے کچھ تو ہے جو قتیل کی لغزش کی علانیہ طور پر چغلی کھاتا ہے، قتیل نے کچھ دن ایسے گزارے جب کہ اس کے شانوں پر اسکی بیوی کے علاوہ ایک اور عورت کی زلفیں پریشان ہو گئی تھیں۔ قتیل اس کی محبت کے بازار میں آوارہ و رسوا گھوم رہا تھا۔ قتیل سرتاپا ایک دل بنا ہوا تھا، لیکن اچانک ایک دن اس کی محبت کا چاند غروب ہو گیا۔ ایک چھناکے کے ساتھ قتیل کا دل ٹوٹ گیا، قتیل پر ایک عرصہ تک نیم دیوانگی کا عالم طاری رہا اور اس کی دیوانگی جیسے زمانے بھر کو سمجھا گئی کہ قتیل کی شاعری میں درد اور مٹھاس دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ کیوں ہو گئے ہیں ____!

اب قتیل کبھی کبھی اس عورت کے بارے میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ اب وہ شمع فروزاں کہاں ہے! لیکن قتیل اس کی جدائی کو ایک بہت بڑا سبق ایک بہت بڑا تجربہ سمجھتا ہے۔ اور وہ اس سبق اور اس تجربے کو بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے شعروں میں گوندھتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں گیتوں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ہمارے آپ کے سامنے سے ایک نہایت خوبصورت عورت چھپاک سے گزر گئی، صرف اس کے جسم کی خوشبو ہے جو باقی رہ گئی ہے اور مشام جان سے ٹکرا رہی ہے۔

جوانی کی اس پہلی لغزش کے بعد قتیل ایک دم سنبھل گیا ہے ____ آج کل وہ صرف ایک قلم ہے، وہ قلم جو جمہور کی امانت ہے جس میں وہ خون جولاں ہے جس سے عظمت انسان کو آنچ آتی ہے، وہ مورخ جس کے سینے میں غم حیات کی تاریخ

کے ورق سرا سر رہے ہیں وہ قلم جس سے مشیت بھی شکست کھاتی ہے اسی لئے قتیل بڑے فخر سے دعوی کرتا ہے کہ

میں خود اسیر سہی میرا فن اسیر نہیں
میرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

محمد طفیل

قتیل صاحب

میں نے بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر مضامین لکھے مگر قلم پر کبھی کپکپی طاری نہ ہوئی۔ مگر قتیل ایک ایسا شخص ہے جس پر لکھتے ہوئے دل گھبراتا ہے۔ سوچتا ہوں نہ جانے وہ میری کسی بات پر خفا ہو جائے اور جانے کس بری بات پر خوش ہو کر ونس مور کہہ دے۔ ایسا تذبذب کیوں؟ آدمی موج کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تعلقات کا بھرم رکھنے کے لئے جملہ انواع و اقسام کی باتیں چھیڑوں گا۔ یعنی تلخ و ترش شیریں!

زندگی کے ابتدائی برسوں میں، میں جن شاعروں اور ادیبوں سے ملا ان میں قتیل کا نام آتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ لڑکپن کے اس دور میں، میں صرف دس بیس ادیبوں ہی سے ملا تھا تو یہ سچ ہو گا۔

نہ جانے وہ کونسی تقریب تھی کہ میں ہری پور ہزارہ جا نکلا۔ وہاں قتیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن کہ ہم ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں۔ تعلقات کی یہ نوعیت جیسی بھی ہو، بے چاق وچوبند، بہرحال تعلقات کی ایسی عجیب سی نوعیت کے باوجود ہم دور دور نہ رہ سکے۔ ویسے یہ مسئلہ الگ ہے کہ کبھی کبھی ہم بلا وجہ ہی ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔ موقع ملے تو یہ تاثر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ آپڑوسن لڑیں۔ اس کے باوجود میرا گمان یہ ہے کہ جیسے انہیں میری ضرورت ہو اور مجھے ان کی۔ جیسے ہم دریا کے دو کنارے ہوں، جو رہیں گے دو ہی اور ان دو کناروں کے درمیان جو دریا بہہ رہا ہو وہ دوستی کا

دریا ہو۔

ہر شخص اپنے آپ کو عقل کل کا مالک اور شائستگی کا مرقع سمجھتا ہے۔ الحمد للہ کہ بندہ بھی اپنے آپ کو ایک ایسا ہی شخص سمجھتا ہے۔ قتیل صاحب کے بارے میں بھی میرا ایسا خیال ہو سکتا تھا' بشرطیکہ یہ پٹھان نہ ہوتے۔!

اصل میں ان میں جتنی خرابیاں یا اچھائیاں ہیں' وہ ان کے پٹھان ہونے کی وجہ سے ہیں۔ میں نے لغت میں پٹھان کے معنی دیکھے۔ وہاں یہ لکھا ہے تھا۔ سپاہی' خونخوار اور لڑاکا' اس سے زیادہ میں قتیل صاحب کی تعریف کیا کروں؟ ویسے میں اگر صاحب لغات کی رائے کو نہ مانوں اور ایمانا" ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں تو وہ کچھ ایسی ہو گی کہ ان کی سپاہیت میں' ان کی خونخواریت میں ان کی "لڑاکیت" میں ایک توازن ضرور ہے۔ فنکارانہ توازن!

پہلے میں نے آپ کو لفظ پٹھان کے معنی بتائے' اب ایک محاورہ بھی سن لیجئے۔ لغت میں لکھا ہے کہ پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت! نہ جانے اہل لغت پٹھانوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر میں نے کوئی لغت ترتیب دی تو میں پٹھان کے معنی بدلوں گا۔ اسی طرح محاورے کو بھی ٹھیک ٹھاک کروں گا۔ اگر ٹھیک نہ کر سکا تو ٹھاک تو کر ہی دوں گا۔

اب آیئے اس ماحول کو ٹٹولیں کہ جس شہر میں پلے اور بڑھے وہ علاقہ ادبی اعتبار سے بنجر تھا۔ کچھ بابو ٹائپ کے لوگ تو تھے مگر ادب کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صاحب نے جب ان سے مشاعرہ کا لفظ سنا تو پوچھا۔ نوشہرہ تو میں گیا ہوں' مشاعرہ کہاں واقع ہے؟

ہری پور ہزارہ میں پہلا مشاعرہ ہوا' وہ انہی کے دم سے ہوا۔ وہ مشاعرہ 1940ء میں یوم اقبال کے سلسلے میں ہوا تھا۔ اس کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ جب ایک دوکاندار سے مشاعرہ کے لئے چندہ مانگا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ مشاعرہ ڈاکٹر اقبال کی برسی کے موقع پر ہو گا' تو دکان دار نے آبدیدہ ہو کر پوچھا۔ "اچھا' ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا"

ہاں ہاں! یہی وجہ ہے کہ ان کی برسی پر مشاعرہ ہو رہا ہے دوسرے لوگوں نے تو

ایک ایک دو دو روپے بطور چندہ دیئے' مگر اس دکان دار نے پانچ روپے دیئے۔ ساتھ ہی کہا: ڈاکٹر صاحب بڑے قابل انسان تھے۔

قتیل صاحب اس تبصرے پر خاصے خوش ہوئے۔ پوچھا "آپ تو ڈاکٹر صاحب کے کام اور نام سے واقف نکلے۔"

"جی ہاں' جی ہاں!"

"بہت خوب!"

"میری بھینس بیمار ہو گئی تھی' ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے علاج کیا تھا۔"

بے شک اس موقعہ پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے' مگر ماحول تھا یہ' جس میں قتیل صاحب پروان چڑھے مگر انہوں نے آہستہ آہستہ وہاں کے ادبی ماحول کو بدلا۔ اب وہاں کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ مشاعرہ کسے کہتے ہیں اور نوشہرہ کسے' اور معلوم یہ بھی ہوا کہ ادب کسی شخص کا نام نہیں بلکہ ادب اس کو کہتے ہیں جو آدمی کو انسان بناتا ہے۔

مشہور ہے کہ یہ دوستوں کے دوست ہیں اور دشمنوں کے دشمن' پھر دوست بھی سیانے دشمن بھی سیانے' شاید یہی وجہ ہے کہ میرے دشمن ہیں۔ میرا ان سے واسطہ نادان دوست والا نہیں' دانا دشمن والا ہے۔

یہ الگ مسئلہ ہے کہ یہ مجھے دانا دوست اور نادان دشمن سمجھتے ہوں۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے میں غلطی ہوئی اور یہ غلطی ہم مسلسل چالیس برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دوستی کی اس اجنبیت پر قدرت بھی حیران ہے۔ اس لئے کہ ہم نے قدرت کے مسلمہ ضابطوں میں رخنہ ڈال رکھا ہے۔

یہ صاف گو ہیں۔ اتنے صاف گو کہ بعض اوقات ان پر منہ پھٹ ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے' مگر اس کا کیا علاج کہ جو شخص صاف "نہیں" نہ کہہ سکتا ہو اس کے بارے میں یہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس کی سیرت ناقص اور خلق ناتواں ہے۔ یہ صاف گو ہوں یا منہ پھٹ' ان کی سیرت ناقص اور ناتواں نہیں ہے۔

قتیل صاحب بڑے فقرہ باز ہیں۔ بڑے کٹیلے فقرے کہتے ہیں۔ پھر ان میں نہ

صرف کٹیلا پن ہوتا ہے بلکہ لطافت بھی ہوتی ہے۔ اس باب میں ایک دو باتیں ہو جائیں۔

جن دنوں قتیل صاحب مجھ سے خفا تھے' میں نے انہیں کہا۔ "کسی دن آیئے کہ آپ کو چرغا کھلایا جائے۔"

کہنے لگے۔ "اب آپ کا چرغا ہضم نہ ہو گا۔"

فارغ بخاری صاحب سے ان کی حد درجہ کی ہے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں سما گئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بارے میں بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ فارغ صاحب کا یہ فقرہ بھی اسی کھاتہ میں سے ہے۔ وہ یہ کہ "قتیل جس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اسے قبر تک معاف نہیں کرتا۔" یہ فقرہ کوئی اور لکھ دیتا تو قتیل صاحب آپے سے باہر ہو جاتے۔ چونکہ معاملہ دوستی کا تھا' اس لئے یہ فقرہ بھی پی گئے۔!

چونکہ دوستی ہے' اس لئے چہلیں یہ بھی کریں گے۔ فارغ بخاری صاحب باتھ روم میں جاتے ہیں تو خاصی دیر لگاتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر احمد ندیم قاسمی کی قتیل شفائی کے ساتھ مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی: ندیم صاحب:
"فارغ صاحب غسل خانے میں جاتے ہیں تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"
قتیل: "وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"کیوں"؟

"وہ کام جس کا علم سب کو ہے' وہ تو کرتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں۔"

"مثلاً" مثلاً"!

"مثلاً" وہ بالوں کو خضاب بھی غسل خانے ہی میں لگاتے ہیں"

اتنے میں فارغ صاحب غسل خانے سے نکلے اور انہوں نے چھوٹتے ہی کہا:
"قتیل تو ہر وقت میری برائیاں کرتا رہتا ہے۔ باز آجا!"
قتیل صاحب نے کہا: "میں نے تو کوئی برائی نہیں کی!"
فارغ: "میں سب سن رہا تھا۔"

قتیل: "میں نے تو صرف بالوں کو خضاب لگانے کا ذکر کیا تھا۔ اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ تیرے سارے دانت بھی مصنوعی ہیں۔"

جس دوست نے قتیل صاحب سے میرا تعارف کرایا تھا' وہ بچوں کے ادب میں اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے میرا ادیبوں سے ملنا جلنا ہوا۔ پھر اسی متذکرہ شخصیت کے اشتراک سے میں نے پبلشنگ ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی' مگر وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ اس اشتراک میں جو حصہ مجھے ملا' وہ ایک جملہ تھا۔ "طفیل ایک نالائق شخص ہے۔ جو کچھ ہوں' وہ میں ہوں۔"

"اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہوں' وہ میں ہوں" مجھے اس سوچ پر کبھی اعتراض نہیں ہوا' بلکہ سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جب کوئی دوست یہ کہتا ہے کہ میں نالائق ہوں تو دکھ ہوتا ہے۔ میری نفی کے ساتھ قدرت کی عنایتوں کو بھی جھٹلایا جاتا ہے۔ اس وقت میری سوئی ہوئی انا بیدار ہوتی ہے۔ تب میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے سلسلے میں حائل پہاڑوں کو بھی ریزہ کر سکتا ہوں' بلکہ صبر اور استقامت کی پونجی کو خرچ کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ وہی مندرج طعنہ آمیز کلمہ' میرے لئے ادب کی وادیوں میں کودنے کا سبب ہوا' اور وہی طعنہ آمیز کلمہ قتیل صاحب سے جنگ چھڑنے کا۔!

قتیل صاحب سے جنگ چھڑنے کی تلمیح' رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہیں۔ قتیل صاحب مجھ سے ہار کر سرخ رو ہو گئے' میں جیت کر اس میں لت پت ہو گیا۔ سارے ادبی کام چھوٹ گئے۔ ان ایک دو جملوں کے علاوہ میں اس موضوع پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

قتیل صاحب کو الیکشن لڑنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلا الیکشن انہوں نے اس وقت لڑا' جب یہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے' الیکشن لڑنے سے پہلے یہ کلاس میں سب سے ہونہار طالب علم تھے۔ الیکشن کے بعد آٹھویں نمبر پر آ گئے۔

چونکہ الیکشن کا تجربہ انہیں بچپن سے تھا۔ اس لئے ادیبوں کی تنظیم رائٹرز گلڈ کے بھی انہوں نے الیکشن لڑے۔ کسی کو بھی دس بارہ برس تک' پاس پھٹکنے نہ دیا۔ ہم نے غلام مصطفےٰ تبسم کو ان کے حق میں دست بردار ہوتے دیکھا۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ جو دوست الیکشن ہار جاتے ہیں، وہ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ مگر آفرین ہے قتیل صاحب پر کہ جب مقبولیت کی بازی کا فیصلہ ہو گیا تو انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لئے بھی پریشان نہ کیا۔ میں قتیل صاحب کے اس وصف پر اگر خط غلامی نہیں تو خط محبت لکھنے کے لئے ضرور آمادہ ہوں۔

قتیل صاحب کا دستر خوان بڑا وسیع ہے۔ مطلب یہ کہ وہ پیروں کی طرح صرف کھانا ہی نہیں جانتے بلکہ مریدوں کی طرح کھلانا بھی جانتے ہیں۔ ویسے رسم تو یہ ہے کہ اپنے سے بڑوں کی دعوت کرو اور خوشنودی حاصل کرو۔ مگر یہ اپنے برابر کے دوستوں کو بھی نوازتے ہیں یا دوستیوں کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف بیرون لاہور کے دوستوں کی دعوتیں کرتے ہیں بلکہ مقامی دوستوں کو بھی اکٹھا کرتے رہتے ہیں، یعنی مل بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈھتے ہیں۔ کھاؤ یا کھلاؤ ان کا روز مرہ ہے!

ذوق بھی عمدہ ہے۔ اچھا کھانا ان کی کمزوری ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ نہاری کس جگہ اچھی ملتی ہے۔ کباب کہاں اچھے بنتے ہیں۔ کھیر کس دکان کی اور چرغا کہاں کا مشہور ہے۔ غرض یہ بڑے چسکے کے آدمی ہیں۔ یعنی یہ چسکے اور چسکی دونوں ہی طرح کے آدمی ہیں۔ ایک دروازہ تو ان پر بند ہو چکا ہے، البتہ دوسرا دروازہ ابھی کھلا ہے یعنی چسکے والا۔

قتیل صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ مجھے مہمانوں کی آمد سے خوشی ہوتی ہے۔ بیوی بھی اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ کوئی مہمان نہ ہو تو گھر اجڑا اجڑا سا لگتا ہے۔

مجھے فارغ صاحب نے بتایا یا کسی اور نے کہ ایک زمانہ میں کہ جب ان کی فاقہ مستی کے دن، مقروض بھی تھے کہ فارغ صاحب ہری پور ہزارہ پہنچے۔ ادھر ان کی جیب خالی، قرض دینے والا کوئی نہ تھا۔ خاصے پریشان ہوئے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ چند روپے بھی کہیں سے میسر نہ آ سکیں گے تو رسالوں کی فائلیں ردی میں بیچ دیں۔ وہ رسالے جو انہوں نے بڑے چاؤ سے اکٹھے کر رکھے تھے، ردی میں بک گئے۔ ذہن کی دنیا لٹ گئی، دل کی دنیا آباد ہو گئی۔

قتیل صاحب شاعری کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ توقع ہے کہ تحریر کی دنیا میں ایک لمبے عرصہ تک یاد رکھے جائیں گے۔ غزل اور گیت ان کا خاص میدان ہے۔ ان دو

شعری میدانوں کے علاوہ، ان کی دھاک ایک اور فیلڈ میں بھی ہے اور وہ ہے فلمی شاعری، جسے انہوں نے ادبی شاعری کے قریب تر کر دیا۔ بعض نامور شاعر فلمی شاعری کی طرف گئے تو اس میں غرق ہی ہو گئے۔ پھر ان کا ادب میں سراغ نہ ملا۔ مگر یہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے ان دونوں جہتوں کا حق ادا کیا۔ بلکہ فلمی گیتوں کو بھی مشرف بہ ادب کیا۔

فلمی دنیا میں انہیں پہلے پہل محبوب اختر لائے جو ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ محبوب اختر تو پاکستان آکر اپنے جوہر دکھا نہ سکے، مگر قتیل صاحب خوب چلے اور خوب چمکے۔ ریڈیو جب بھی سنیں گے، کسی نہ کسی اسٹیشن سے ان کے نغمے براڈ کاسٹ ہو رہے ہوں گے۔ اس میدان میں ان کی مقبولیت ادبی دنیا سے کچھ زیادہ ہی ہے، مگر یہ مسئلہ وقتی ہے۔ دائمی زندگی ان کے نام سے چھپے ہوئے اکھروں ہی کی بدولت ملے گی۔

یہ فلم میں تو روزگار کی خاطر گئے تھے، تاکہ ادب کی طرف، بے فکری کے ساتھ رجوع کیا جا سکے۔ فلم لائن اختیار کرنے سے پہلے ان کا صرف ایک مجموعہ "ہریالی" منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد جتنے بھی مجموعے سامنے آئے، وہ فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کے بعد ہی آئے۔

غرض یہ روزگار کی خاطر، بھٹکنے والی عمر کا سارا حصہ فلمی دنیا میں گزار آئے۔ عورت زدگی کی بجائے عورت نگاری کرتے رہے۔ ناگاہ جہاں دل حاوی ہو گیا، وہاں انہوں نے تدبیر کی چادر ڈال دی۔ بے شک وہاں ترغیب اور پھسلنے کے سینکڑوں مواقع تھے، مگر یہ زیادہ تر دامن کشاں رہے۔ اگر کہیں ڈولے بھی تو ہوش مندی کے ساتھ، سنبھلے بھی تو سود و زیاں کی تمیز کی بدولت، غرض چھینٹے بہت اڑے، داغ بھی خاصے لگے۔ مگر اس صاحب تدبیر انسان نے گھر کے ماحول کو پر سکون رکھنے کے لئے خاصے جتن کئے۔

پچھلے دنوں قتیل صاحب ہندوستان گئے تھے، محض سیر و تفریح کی خاطر، مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کی فلم انڈسٹری میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ جیسے نو رتنوں میں سے کوئی ایک رتن ان کے ہاں پہنچ گیا ہو۔

چند دوست جو ادب کے میدان میں ان کے رفیق تھے وہ انہیں اپنے ہاں پاکر اور ان کی پذیرائی کو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھک گئے اس کے بعد بھٹک گئے' جب کاروباری بدگمانیاں بڑھنے لگیں' تو یہ چپکے سے حسب پروگرام واپس آ گئے۔

قتیل صاحب نہیں چاہتے کہ ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ بہ سلسلہء قلم ہو وہ ادب کے خادم علم بن کر ابھرنا چاہتے ہیں۔ وہ ادب کی راہوں میں اپنی خوشبو قائم رکھ کر سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔

قتیل صاحب دشمنیاں ہی نہیں پالتے' دوستیاں بھی پالتے ہیں۔ دوستیاں پالنے کا جذبہ ان کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے۔ ان کے جو دوست ہیں' وہ ان کے نزدیک ہر طرح کی طرف داری کے مستحق ہیں۔ جھوٹے ہوں تو سچے ہوں تو۔!

خلاف مزاج کسی بات کو برداشت نہیں کر سکتے' مصلحت آمیز سمجھوتے ان کی زندگی سے یکسر خارج ہیں۔ عرصے کی بات ہے کہ یہ ریڈیو کے کسی بڑے افسر سے ناراض ہو گئے' باقاعدہ ٹھن گئی۔ قتیل صاحب نے باقاعدہ تحریک چلا دی کہ ادیب ریڈیو کا بائیکاٹ کریں۔ لاہور کے ادیبوں نے قتیل صاحب کا ساتھ دیا۔ اشتہارات چھاپے گئے۔ پوسٹر نکالے گئے۔ اخباروں میں لکھا لکھایا گیا' بات افسران بالا تک پہنچی۔ بالاخر اس افسر کو تبدیل کرایا' تب قتیل صاحب نے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر انکشاف کیا' میں تو اس کی جد پشت کو تبدیل کرا دیتا۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ میاں بیوی میں سال میں ایک دو جھڑپیں ضرور ہونی چاہئیں۔ ضرور ایک دوسرے کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنا چاہئے۔ اگر یہ کچھ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہو جائے۔ جینے کا لطف جاتا رہے ہے' تجدید محبت کے امکانات ختم ہو جائیں۔

میرا خیال ہے کہ اس فارمولے پر قتیل صاحب بھی عمل پیرا ہیں۔ بیوی میاں سے ڈرتی ہے' میاں بیوی سے' جس لمحے دونوں ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے تو اس لمحے کچھ ہوا ہو تجدید محبت کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں نے ایک دن بھابی سے پوچھا۔ "آپ کیوں قتیل صاحب سے لڑتی ہیں۔؟"

"میں کہاں لڑتی ہوں لڑتے تو وہ ہیں۔"

"اچھا!"

"مگر یہ آپ کو بتایا کس نے؟"

"بتانا کس نے ہے۔ یہ سوال وہ ہے کہ جو ہر میاں بیوی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے' یہ سوال بھی یونیورسل ہے اور جواب بھی یونیورسل!"

قتیل صاحب کی جزئیات پر بڑی نگاہ رہتی ہے۔ وہ آپ کو دیکھیں گے تو فورا" یہ تک جان سکیں گے کہ آپ کی قمیض میں کتنے بٹن لگیں گے' یا آپ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹا ہوا ہے یا ٹھیک ہے یا یہ کہ آپ کی مونچھوں میں کتنے بال سفید ہیں اور کتنے کالے!

پھر ان کا دماغ بڑا حاضر ہے۔ وہ آپ کو آج سے بیس برس پہلے کی ملاقات کا تفصیلی حال بتا سکتے ہیں۔ جتنی باتیں ہوئی ہوں گی' ان کی ذرا ذرا سی تفصیل بھی ان کے ذہن سے باہر نہ ہو گی۔

قتیل صاحب تو جزئیات پر دسترس اور اس نوع کی حاضر دماغی کی تردید ہی کریں گے۔ کہیں گے کہ مجھے تو اشعار تک یاد نہیں رہتے' لیکن شخصی میل جول میں' ان کی یاد داشتیں حیران کن ہوتی ہیں۔"

میں نے قتیل صاحب سے دریافت کیا۔ صدر ایوب کے زمانے میں یہ مشہور ہوا تھا کہ حکومت نے آپ کو سرکاری طور پر نوازا تھا' موتیوں سے منہ بھر دیا تھا۔ کہنے لگے' سب افواہیں ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ جب میں رائٹرز گلڈ کا ریجنل سیکرٹری تھا تو انعامات کی تقریب میں صدر ایوب سے ملاقات ہوئی تھی۔ گلڈ کے سیکرٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے صدر سے میرا تعارف یوں کرایا تھا کہ یہ بھی آپ کے شہر کے ہیں۔ یعنی ہری پور ہزارہ کے!

اس پر صدر نے کہا تھا۔ "کوئی خدمت بتایئے؟"

جواب میں میں نے کہا تھا کہ میں اس بات پر خوش ہوں کہ آپ مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے رائٹرز کالونی کی درخواست صدر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی تھی کہ ادیبوں کا کچھ کیجئے۔ انہوں نے وہ درخواست شہاب صاحب کو دے دی تھی۔ شہاب صاحب نے گورنر صاحب کو بھجوا دی تھی۔ اس کے

بعد درخواست کا سراغ نہ ملا۔

اس موقع پر میں نے پھر سوال کر ڈالا۔ "یار ان دنوں دستاویزی فلمیں بنانے کے لئے بھی تو حکومت نے آپ کو روپیہ دیا تھا۔"

"ہاں ہاں دیا تھا' مگر وہ تو مزدوری تھی۔"

قتیل صاحب نے غیرملکی دورے بھی کئے ہیں۔ جن دنوں یہ رائٹرز گلڈ پنجاب کے سیکرٹری تھے' یہ روس گئے تھے۔ ادیبوں کا ایک وفد روس گیا تھا' جس میں ان کے دو ساتھی مشرقی پاکستان کے تھے۔ مثلاً" پروفیسر شوکت عثمان اور سرور مرشد!

مگر یہ روس سے خوش نہ لوٹے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں ایک سیاح کے طور پر اپنایا گیا' ایک ادیب کی حیثیت سے برتا نہ گیا۔

روس کے دورے کے بعد قتیل صاحب نے لندن کا رخ کیا۔ اپنے بیٹے کے پاس گلاسگو گئے۔ وہاں بیٹے کی انگریز بیوی سے جیسی گفتگو کرتے رہے' وہ کچھ کچھ خاتون کے لئے اجنبی تھی اور کچھ کچھ ان کے لئے۔!

غرض یہ لوٹے تو بہت خوش تھے' کیونکہ انگریزوں کی دریا دلی نے ساری کلفتیں دور کر دی تھیں۔ آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی' دل کی دنیا مہک اٹھی تھی۔ ایک شاعر کو اور کیا چاہئے تھا؟

یہاں ایک فقرہ لکھنا چاہتا ہوں' مگر وہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہ کردار کی بے عمل خوبیوں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں!

میں نے شروع میں ایک محاورہ تحریر کیا تھا کہ "پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیاء گھڑی میں بھوت" بے شک یہ بھوت بن کر بہت سامنے آئے' مگر اب یہ انسانی عظمتوں کی تکریم کر کے اولیاء بننے کے چکر میں ہیں!

غرض ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب نہ تو قتیل صاحب کی طبیعت میں ویسی تنک مزاجی رہی اور نہ ہی ویسی سینہ زوری' کیونکہ عمر کے ساتھ ان کی شوخیاں اور طراریاں بھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تدبر کی جھلملاہٹوں سے زندگی منور ہو رہی ہے۔

میرا یہ مضمون' تاثر کچھ ایسا دے رہا ہے کہ جیسے میں قتیل صاحب سے اب

بھی روٹھا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی قلبی کیفیتوں کا ذکر کرنا تھا سو وہ کر دیا۔ میں نے جتنا قتیل صاحب کو جانا تھا وہ بھی آپ کو بتلا دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا!

باقی رہا قتیل صاحب کے بارے میں غیر تعصباتی تبصرہ' وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک چاند ہے جو روشنی دیتا ہے۔

"کیا آپ نے کوئی ایسا چاند دیکھا ہے' جو روشنی نہیں دیتا؟"

"میں نے بہت دیکھے ہیں!"

فارغ بخاری

رنگوں کا رسیا

قتیل کی رنگا رنگ شخصیت پر کچھ لکھنا آسان کام نہیں۔ اس کا خمیر کچھ ایسے مختلف النوع رنگوں اور خوشبوؤں کے امتزاج سے اٹھایا گیا ہے، جن کی گہرائی لامحدود اور وسعت بے پایاں ہے

38ء میں اپنے ساتھی رضا ہمدانی کی معیت میں میں نے ہفت روزہ شباب' اور ماہنامہ نغمہ حیات' کا پشاور سے اجراء کیا۔ انہی دنوں ہم ایک ترقی پسند ادبی ادارے "ادبستان" کا قیام بھی عمل میں لائے' دفتر میں ہر وقت سیاسی اور ادبی دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ایک دن لاہور کے ایک صحافی کے ساتھ ایک سانولا سلونا نوجوان وارد ہوا' اور جب تعارف کے بعد اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں غزل سنائی تو ہم مسحور ہو کر رہ گئے' یہ نوجوان قتیل شفائی تھا۔ 34 برس پہلے کا یہ واقعہ آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو' ان دنوں وہ چونگی میں ملازم تھا' اور اپنی جنم بھومی ہری پور سے باہر نہ نکلا تھا۔ شہرت و ناموری چشم براہ تھی کہ وہ گاؤں سے باہر قدم رکھے اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ چونگی کی نوکری زیادہ دنوں تک اس کا ساتھ نہ دے سکی اور وہ ایک نجی ٹرانسپورٹ کمپنی ملازمت کرنے پنڈی پہنچ گیا۔ پنڈی میں قیام کے دوران اس کے شاعرانہ جوہر چمکے' اور کچھ عرصہ بعد ہی ملک کے مشہور ادبی مجلّہ "ادب لطیف" کی ادارت کے لئے اسے لاہور بلا لیا گیا۔ لاہور جانا قتیل کے لئے نیک فال ثابت ہوا' دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہاں کی ادبی اور فلمی دنیا کا مقبول و محبوب شاعر بن گیا۔

لاہور میں قتیل کے ابتدائی ایام نہایت کڑے گزرے۔ "ادب لطیف" سے اسے محدود سی تنخواہ ملتی تھی۔ مشاعروں اور فلموں کی آمدنی غیر یقینی تھی، مہینوں فقرو فاقہ کی زندگی گزارنا پڑتی، اسے کھانے کے لئے میلوں پیدل چل کر ایک تیسرے درجے کے سستے ہوٹل میں جانا پڑتا تھا۔ جس کے ساتھ اس کا قرض کا کھاتہ چلتا تھا۔ پھر اس نے ہری پور سے بچوں کو بلا لیا تو مشکلات اور بڑھ گئیں۔ بڑھتے ہوئے اخراجات کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے شب و روز محنت کرنی پڑتی تھی، لیکن ہوائی آمدن کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ کوئی مہینہ اچھا لگ جاتا تو گھر میں چہل پہل نظر آتی، ورنہ وہ عموماً" قرض خواہوں سے آنکھیں چراتا پھرتا مجھے یاد ہے کہ قتیل کے ایک دوست ڈاکٹر ہے جو مشہور افسانہ نگار بھی ہے، اس کے بخار میں پھنکتے ہوئے بچے کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کے پچھلے بل کی ادائیگی میں دیر ہو گئی تھی۔ یہ دن برے تھے لیکن قتیل کی خندہ پیشانی نے انہیں ناگوار بننے نہیں دیا۔ اس کی حوصلہ مندی نے کبھی حالات سے شکست تسلیم نہیں کی۔ مایوسی و بد دلی کے الفاظ کو جیسے اس نے اپنی لغت سے خارج کر دیا ہو، ہمیشہ مثبت اور روشن پہلو پر ہی اس کی نظر رہتی تھی اور اپنے درخشندہ مستقبل پر اسے پختہ یقین ہے۔ ہر حال میں خوش رہنا اور مصائب و آلام کو خاطر میں نہ لانا اس کی زندگی کے سنہری اصول ہیں۔

سرحدی ہونے کے ناطے، مہمان نوازی قتیل نے ورثہ میں پائی ہے۔ فقرو فاقہ کے دنوں میں بھی اس کے ہاں مہمانوں کا ہجوم رہتا اور کبھی اس کے دل پر میل تک نہیں آتی تھی۔ وہ قرض لے کر مہمانوں کی پذیرائی کرتا اور اپنی حالت کا انہیں احساس تک نہ ہونے دیتا۔ خوش پوشی اور خوش خوراکی اس کی زندگی کا لازمہ ہے لیکن اسے حالات کے مطابق اپنے دکھ ڈھالنے میں بھی بڑا ملکہ حاصل ہے۔ مالی بحران کے دنوں میں جب ہم رات کے دو بجے اس کے گھر جا کر ٹھنڈی دال روٹی سے پیٹ کی آگ بجھاتے تو وہ اس وقت دال کی تعریف ایسے شاعرانہ انداز میں کرتا، اور اس کے فوائد اس عمدگی سے گنواتا کہ وہ دال بھی پلاؤ کا لطف دے جاتی۔

اپنی پسند، ناپسند کو بڑی شائستگی اور فنکاری سے دوسروں پر ٹھونسنے میں قتیل بڑا ماہر واقع ہوا ہے۔ جن دنوں اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ پیتا تھا، ہمیں درمیانہ قسم کے

سگریٹ پیتا دیکھ کر کہتا ـ "بھائی سگریٹ کم پیو اور اچھے پیو' گھٹیا سگریٹ سے جان کو روگ لگا بیٹھو گے" پھر ہماری طرح کے سگریٹ پینے لگا' تو ہم نے پوچھا۔ "کیوں بھئی تم تو ایسے سگریٹ پینے سے منع کرتے تھے' اب خود ہی ان پر آ گئے!" تو مسکرا کر بولا۔ "یار سچ پوچھو تو سگریٹ سب کے سب ایک ہی چیز ہیں' صرف اچھی پیکنگ کر کے اور اچھی برانڈ کا نام دے کر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے' غور سے دیکھو تو وہی تمباکو' وہی نشہ' وہی ذائقہ' یہ اچھے برے کا فرق ہمیں بے وقوف بنانے کے لئے رکھا گیا ہے۔ پھر ہم بے وقوف کیوں بنیں اور اپنی محنت کی کمائی کیوں ضائع کریں۔"

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی دوستیاں' دشمنیاں بھی دوستوں پر ٹھونسنے کے لئے مصر رہتا ہے۔ پرانے دوستوں سے اس کی وفاداری مثالی ہے' لیکن اس کی نئی دوستیاں جو عموماً" مصلحتوں پر استوار ہوتی تھیں' ہمیشہ ناپائیدار ثابت ہوتی ہیں۔ وہ نئے آشناؤں کی ظاہری چکا چوند سے متاثر ہو کر ان کے قصیدے گانے لگے گا لیکن جب ان کا اصلی روپ دیکھے گا تو اپنی عجلت پسندی پر پشیمان ہو کر چھلکے اتارتے اتارتے انہیں بالکل ننگا کر کے چھوڑے گا۔

وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا بدترین دشمن ہے۔ اس معاملہ میں وہ پکا پٹھان ہے۔ جس سے دوستی ہو گئی' اس سے زندگی بھر ساتھ نبھایا' جس سے بگڑ جائے اسے قبر تک معاف نہیں کرتا۔ وہ دوستوں سے بھی توقع رکھتا ہے کہ اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ میں اس کا ساتھ دیں' لیکن خود دوستوں کے لئے اس اصول پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

قتیل میں نخوت کا شائبہ تک نہیں لیکن مختلف طریقوں سے وہ اپنی برتری کا احساس دلانے سے کبھی نہیں چوکتا۔ شاید یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو کہ بعض اوقات وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے جگری دوستوں کی انا کو مجروح کرنے کی عامیانہ حرکت بھی کر بیٹھتا ہے۔ یہ غیر شعوری عمل اس کی معذوری کا نتیجہ ہے' جس میں میرے نزدیک اس کی نیت اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اس کی خوبی ہے یا کمزوری---- بہرحال ایسا رنگ ہے جو اس کی شخصیت کا جزو بن چکا ہے اور اس کے بغیر اس کا خاکہ مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔

قتیل کی زندگی کے اور بھی بہت سے رنگ ہیں۔ شوخ بھڑکیلے رنگ بھی، خوشگوار رنگ بھی، چبھنے والے رنگ بھی۔ زمانے کے گرم و سرد نے اسے کسی حد تک دنیادار ضرور بنا دیا ہے لیکن اس کے اندر کی معصومیت زندہ ہے۔ اور جب وہ ابھر کر سامنے آتی ہے تو نمکین چہرے پر مہکتے مہکتے رنگوں کی دھنک پھوٹ پڑتی ہے اور وہ کسی ملکوتی دنیا کی مخلوق لگتا ہے۔ کاروباری دنیا میں اس کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے۔ عشق و رومان کے ماحول میں وہ محبت اور پرستش کے دیوتا کا رنگ لئے ہوتا ہے اور خرابات کی نشیلی فضا میں دو ایک جام چڑھاتے ہی سارے مصنوعی رنگ جھٹک کر وہ اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں ایک سیدھے سادے سچے فنکار کے روپ میں مسکراتا، قہقہے لگاتا اور لطائف و ظرائف کے دریا بہاتا نظر آتا ہے۔

قتیل ہمارا پرانا ساتھی ہے۔ وہ ادب کے اس مکتبہء فکر سے تعلق رکھتا ہے، جو مثبت، صحت مند اور انقلابی اقدار کو فروغ دینے کا قائل ہے اور ان بالغ نظر ادیبوں میں سے ہے جنہوں نے اس نظریہ کو سوچ سمجھ کر قبول کیا، پوری مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی سے اسے اپنایا، اس وقت بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی جب ترقی پسند مصنفین کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا۔ اور بڑے بڑے بقراط قسم کے ادیب، شاعر مستعفی ہو کر گوشہ عافیت میں جا بیٹھے یا سودا بازی کر کے بڑے بڑے سرکاری عہدے سنبھال لئے۔ رجعت پرست استحصالی قوتوں نے ترقی پسندوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان پر حصول معاش کے دروازے بند کر دیئے۔ قلم پر پہرے لگا دیئے اور انہیں آہنی سلاخوں کے پیچھے محبوس کر دیا۔ قتیل نے اپنے فن کی عظمت کو بلند رکھا۔ اپنے قلم کی آبرو کا تحفظ کیا اور اس کی پاداش میں وہ ساری اذیتیں ہنسی خوشی برداشت کیں جو اس ظالمانہ دور میں ایک نڈر اور بے باک فنکار کا مقدر بن چکی تھیں۔

قتیل نے سازشی اور مفاد پرست ذہنوں کو ہر محاذ پر شکست دی۔ علم سے فلم تک، ریڈیو سے مشاعرے تک اور اخبار سے دربار تک قتیل نے اتنی شہرت کمائی کہ پاکستان کے تمام بڑے صنعت کار داؤد جی، آدم جی، اصفہانی، سہگل جی وغیرہ نے مل کر اتنی دولت نہیں کمائی ہو گی، لیکن اس نے ہوشیاری یہ کی کہ اپنی یہ دولت غیر ملکی

بینکوں میں جمع نہیں کرائی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عوامی حکومت آنے پر یہ مال اپنے ملک میں منتقل کرنا پڑے گا۔

قتیل نے اپنے فن کی پرورش کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اسے اپنے فن سے عشق ہے اور اس کی راہ میں اس نے کسی چیز کو حائل ہونے نہیں دیا۔ وہ برصغیر ہندو پاک میں فلمی دنیا کا مقبول نغمہ نگار ہے۔ ہمارے بیشتر شاعر فلمی ماحول میں جا کر دم توڑ دیتے ہیں' لیکن اس نے وہاں بھی فن کی عظمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے گیتوں میں جھرنوں کی گنگناہٹ اور باد صبا کے نرم جھونکوں کا ترنم محسوس ہوتا ہے۔ وہ حسن اور رومان کا شاعر ہے لیکن اس نے انقلابی نغمے بھی گائے ہیں.... وہ حقیقت میں شاعر ہے' سچ کہتے نہیں گھبراتا اور حقائق کو غلافوں میں چھپانے کو فنی بددیانتی سمجھتا ہے۔ اس نے ٹوٹ کر عشق بھی کئے' رسوائیاں بھی خریدیں' بدنامیاں' بھی مول لیں' لیکن زندگی کے ہر تجربے کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ وہ تصنع آمیز ماورائی شاعری کا قائل نہیں۔ اپنی کمزوریوں کو بھی اس نے دفن کرنے کے بجائے فن میں سمو کر پیش کیا۔ اس کے گیت، غزلیں اور نظمیں صداقت اظہار کے لئے بے مثل شاہکار ہیں۔ اس نے ہمیشہ جو کچھ محسوس کیا برملا کیا۔ کسی قسم کے ابہام سے اپنے فن کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا' کیونکہ اس کا ذہن صاف ہے۔ اس میں کوئی الجھن نہیں' اپنی منزل کا تعین وہ کر چکا ہے' اس لئے سفر میں بار بار راہیں بدلنے کی اسے ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کا لہجہ منفرد ہے' سوچ اپنی ہے۔ اس نے بعض دوسرے شعراء کی طرح تقلید کی بیساکھیوں یا ستائش باہمی کے زینوں سے اوپر اٹھنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے نظریئے سے روشنی حاصل کی اور اپنی مسلسل محنت' ریاضت اور لگن سے اپنے لئے مقام بنایا۔

آج نصف صدی عمر گزرنے کے بعد بھی اس کا ذہن زنگ آلود نہیں ہونے پایا اور اس کی سوچ اسی طرح شفاف اور براق ہے کیونکہ اس اپنے ذہن و فکر کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے ہیں۔ وہ تازہ ہواؤں سے خوف نہیں کھاتا بلکہ انہیں صحت مندی کی علامت سمجھتا ہے اور جس فنکار نے یہ نکتہ جان لیا' اس کا فن کبھی نہیں مر سکتا۔

اے۔ حمید

یاروں کا یار، قتیل

کسی نے قتیل شفائی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا:
"جب آپ مصری شاہ کے پل کے نیچے سے گزریں گے تو آپ کو کوڑے کرکٹ کا ایک گڈا ملے گا، آپ اس گڈے کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں، جہاں پہنچ کر گڈا کوڑا کرکٹ پھینکے گا، بس وہیں سامنے میرا گھر ہے۔"

قتیل شفائی کا یہ مکان رحیم روڈ مصری شاہ میں تھا، لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میں اپنا مضمون اس سے پہلے شروع کرنے والا ہوں۔ قتیل شفائی سے میری پہلی ملاقات 1947ء میں ہوئی۔ کہاں ہوئی؟ یہ یاد نہیں رہا۔ شاید میکلوڈ روڈ پر ہفتہ وار فلمی پرچے "اداکار" کے دفتر میں رائل پارک کے ہوٹل میں یا "ادب لطیف" کے دفتر میں۔ ماضی میں پیچھے جاتا ہوں تو قتیل کی ایک شکل ابھرتی ہے، گھنے سیاہ گھنگھریالے بال، مضبوط قوت ارادی کی علامت چوڑے نتھنوں والی ستواں رومن ناک، سرخ و سپید مسکراتا ہوا خوبصورت چہرہ، ہزارے کی مردانہ وجاہت کا بھرپور مظہر۔۔۔ والہانہ جذبات اور تیز فہم کی عکاس آنکھیں، شعروں میں پائل کی کھنک، باتوں میں بے ساختگی و بے باکی، کوئی لگی لپٹی نہیں۔ پیٹھ پیچھے کرنے والی باتوں کو منہ پر کہہ دینے والا۔۔۔ ناراضگیاں مول لینے والا۔ بات کا پکا، وقت کی نزاکت کو پہچاننے میں، شعر کہنے والا، خدا داد استعداد کا مالک، غزل میں ایک منفرد آواز، گیتوں میں ایک شوخ و دلگداز نیا آہنگ امتزاج، نظموں میں تغزل اور گیتوں کی رم جھم کا امتزاج، حفیظ جالندھری کے

بعد گیت کو ایک نئی زبان' نیا آہنگ اور ہزارے کی ٹاہلیوں دھریکوں اور گلابوں کی خوشبو عطا کرنے والا۔ میلوں کا فاصلہ طے کر کے کنویں پر پانی بھرنے آنے والی مٹیاروں کی آہوں' دل کے پوشیدہ دکھوں اور بے نام جذبوں اور چاندی کی پائیلوں کی کھنک کا امین ___ قتیل شفائی۔۔

قتیل نے رائل پارک میں ایک بلڈنگ کا نچلا پورشن لے رکھا تھا' میں احمد راہی اور ساحر لدھیانوی ساتھ والی بلڈنگ کے ایک خالی کمرے میں رہتے تھے۔ قتیل فلمی رسالے "اداکار" کا ایڈیٹر تھا۔ "اداکار" کا دفتر میکلوڈ روڈ پر رٹز سینما کے برابر ہوا کرتا تھا۔ دو چار کیبن بنے ہوئے تھے۔ قتیل سے ملنے ہم یہاں آیا کرتے تھے۔ چائے پیتے' دنیا جہاں کی باتیں کرتے' ہمارا ایک گروپ بن گیا تھا۔ قتیل ہمارے گروپ کا زندگی سے بھرپور قہقہوں اور دلچسپ باتیں کرنے والا پیارا دوست تھا۔۔ سارا سارا دن تقریباً" اکٹھے ہی بسر ہوتا۔ "اداکار" کے دفتر سے نکلتے تو "ادب لطیف" کے دفتر میں آ جاتے۔ وہاں سے اٹھتے تو پاک ٹی ہاؤس میں آ جاتے۔ یہاں سے نکلتے تو رائل پارک کے کسی ہوٹل یا قتیل کے کمرے میں آ کر محفل جما لیتے۔ ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں قتیل کی غزلوں کا ترنم گونجا کرتا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا جیالا شاعر تصور کیا جاتا۔ سبھی اس سے پیار کرتے اور انجمن کے انتظامی امور میں اس سے مشورہ کرتے۔ ہمارے ہاں شاعروں سے زندگی کے کسی مسئلے میں مشورہ لینا اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہے'۔ مگر قتیل کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ شاعر بھی بھرپور ہے اور یقین کریں کہ زندگی کے اہم مسائل میں آپ کو بڑا صحیح مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ وہ شعر کے ساتھ ساتھ دنیاوی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتا ہے' اور ہر طرح کی وضع داری نبھاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچے فنکار شاعر یا ادیب کے لیے ندی کے ان دنوں دونوں کناروں کو آپس میں ملانا ایک کٹھن کام ہے' لیکن یقین کریں قتیل شفائی کے معاملے میں یہ دونوں کنارے ایک مقام پر پہنچ کر آپس میں مل جاتے ہیں۔

قتیل شروع ہی سے خوش لباس' خوش گفتار' اور خوش خوراک ہے۔ اس اعتبار سے وہ خوش قسمت ہے کہ پہلے دن ہی سے اسے معاشی آسودگی میسر آ گئی ہے

اور اس کے شعروں نے نوٹ بنانے شروع کر دیئے تھے۔ ادبی شاعری کے علاوہ فلمی شاعری میں بھی قتیل نے شروع ہی سے ہی سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ جہاں تک پاکستان کی فلمی شاعری اور فلمی گیتوں کا تعلق ہے قتیل شفائی اس کے بانیوں میں سے ہے۔ اس کا تقریباً" ہر فلمی گیت پاکستان اور بھارت میں یکساں مقبول ہوا۔ اس کے فلمی گیتوں میں بھی ادبی کاوش اور شعری فن کار فرما ہوتا ہے۔

بھارتی فلم انڈسٹری بھی قتیل کے منفرد شعری اسلوب سے اپنا دامن نہ بچا سکی اور بھارت کے فلمی شاعر قتیل کی زمینیں اور مصرعے اڑا لے گئے۔ پتلون قمیض اس زمانے کا عام پہناوا تھا' قتیل بھی گرمیوں میں پتلون قمیض اور سردیوں میں گرم سوٹ پہنتا۔ مگر ہم کرتا پاجامہ ہی پہنا کرتے تھے۔ کرتا بھی کھدر کا ہوتا۔ کبھی سفید ٹوپی یا بوسکی کا' قتیل شفائی عام طور پر سلک کا کرتا پہنا کرتا۔ کبھی کسی مشاعرے میں بھارت یا ڈھاکہ جاتا تو وہاں سے اپنے کرتوں کے لئے سلک لاتا۔ ایک بار میں نے اسے ہاتھ سے بنے ہوئے سلک کے کرتے میں ملبوس دیکھا تو مجھے اس کی خوش لباسی سے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں خود خوش لباس ہوں اور سلک اور بوسکی میری کمزوری ہے۔ مگراب نہ دو گھوڑے باقی ہیں نہ بوسکی' سلک تو دور کی بات ہے۔

ابتدا ہی سے اپنی مصروفیات کے باعث قتیل شفائی ہمارے ساتھ راتوں کو آوارہ گردی نہیں کرتا تھا۔ میری راتوں کی آوارہ گردی کے ساتھی منیر نیازی اور ناصر کاظمی تھے۔ میرے کچھ ادیب اور شاعر دوست صحت کا بہت خیال رکھتے تھے اور رات کو جلدی سو جانے کے عادی تھے' ان میں اشفاق احمد' ابن انشاء سر فہرست تھے۔ قتیل شفائی راتوں کو جلد سو جانے کا عادی نہیں تھا' لیکن اس کی فلمی مصروفیات آڑے آ جاتی تھیں۔ اسے آدھی آدھی رات فلمی اسٹوڈیوز میں رہنا ہوتا تھا۔ اپنے گانوں کی ریکارڈنگ اور پکچرائزیشن کے لئے اور کچھ دوسرے گانوں کی ریکارڈنگ اور ڈبنگ کے لئے' یہ بھی فلمی مصروفیات کا ایک ناگزیر حصہ تھا اور ایک وضع داری تھی جسے قتیل اب تک پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ نبھا رہا ہے۔ میں اسے مار مار کر دشت آوارہ گردی کی طرف لاتا اور وہ ہر بار دامن چھڑا کر فلم سٹوڈیوز کی طرف بھاگ جاتا۔ اس زمانے میں قتیل نے بہت محنت' لگن اور ذمے داری کا کام کر کے فلمی گیتوں کے جو

بیج بوئے تھے اس کی بھرپور فصل کاٹ رہا ہے اور مجھے اس کی بے حد خوشی ہے۔ میری نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گی۔

اپنے دوسرے دوستوں کی طرح قتیل شفائی سے بھی میری بڑی پرانی یاری ہے۔ وہ میرا بڑا پرانا یار ہے۔ دوسرے دوستوں سے میری لڑائیاں بھی ہوئی ہیں اور اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے گلے شکوے بھی رہے ہیں، مگر قتیل کے ساتھ میری آج تک نہ کوئی لڑائی ہوئی ہے اور نہ کبھی کوئی ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے کہ نوبت قطع کلامی تک جا پہنچے، میرا خیال ہے جس میں قتیل کی کشادہ ظرفی کا زیادہ ہاتھ ہے، دوستوں کے معاملات میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دوستی کے معاملات میں وہ کشادہ ظرف ہے۔ اختلافات وہ بہت کرتا ہے، ان اختلافات کو وہ جذبات میں ملوث نہیں ہونے دیتا۔ ترقی پسندی کے جن اصولوں کو لے کر وہ شروع سے چلا تھا۔ آج بھی ان پر روز اول کی طرح کاربند ہے۔ یہاں بھی اس کی وضع داری بہ تمام و کمال قائم ہے۔

یادوں کے دریچے میں بیٹھ کر نیچے ماضی کی یادوں میں جھانکتا ہوں، تو دھند میں لپٹے ہوئے گزرے واقعات ڈوبتے ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یادوں کے نو لکھے ہار ٹوٹ کر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں کسی باغ میں کوئی انمول موتی پڑا ہے۔ کسی سڑک پر ایک زمرد چمک رہا ہے تو کسی روش پر کوئی یاقوت دمکتا دکھائی دیتا ہے۔ سلک گوہر تابدار غائب ہے، مگر گوہر تابدار جگہ جگہ یادوں کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان شمعوں کی روشنی میں مجھے جگہ جگہ قتیل شفائی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ مجھ سے "اداکار" کے دفتر میں کرسی پر بیٹھا بات کر رہا ہے۔ وہ رائل پارک کے برسٹل ہوٹل میں میرے سامنے بیٹھا ہے اور چائے کی پیالیوں میں سے گرم مہک اٹھ رہی ہے۔ اور "ادب لطیف" اور سویرا کی باتیں۔ دوستوں کی باتیں۔ "اداکار" یا "ادب لطیف" میں چھپنے والے میرے کسی افسانے کی باتیں۔ یہ شمع یادوں کے سٹیج کے پردے کے عقب میں چلی جاتی ہے۔ پھر ایک اور شمع کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور اس کی دھندلی روشنی میں پاک ٹی ہاؤس کے ایکٹ کا پردہ اٹھتا ہے۔ لوگوں کی باتوں کی آوازیں۔ ہلکے ہلکے قہقہے، کاؤنٹر پر سراج الدین یا حکیم الدین کی بیروں کو بلانے والی

گھنٹی کی آوازیں--- بیرے چائے لا رہے ہیں' خالی برتن اٹھا رہے ہیں۔ بل بنوا رہے ہیں' بل دے رہے ہیں۔

"لال! ہاف سیٹ چائے۔"

"اچھا"

ایک طرف حلقہ ارباب ذوق والوں کی منڈلی جمی ہے' دوسری طرف ترقی پسند مصنفین والے بیٹھے ہیں۔ سیڑھیوں کے پاس والی بڑی میز پر آزاد خیال مصنفین بیٹھے چائے پر گرما گرم بحث کر رہے ہیں۔ ہر طرف گرما گرمی' جوش و خروش اور والہانہ پن ہے۔ وہ بڑے جوش و خروش اور والہانہ پن کا زمانہ تھا۔ ہم آوارہ گردیاں بھی کرتے تھے اور افسانے' غزلیں اور نظمیں بھی لکھتے تھے۔ میں' قتیل اور احمد راہی ایک میز پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ قتیل کو بعض امور کے سلسلے میں احمد راہی سے اختلاف تھا۔ احمد راہی بھی اختلاف کو دل میں رکھنے والا نہیں' بلکہ اس کا برملا اظہار منہ پر کرنے کا عادی ہے۔ ٹی ہاؤس کی فضا میں سگرٹوں اور چائے کی خوشبو مخلوط ہو رہی ہے۔ ابن انشا اور حمید اختر ٹی ہاؤس میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہم نے ایک اور ہاف سیٹ کا آرڈر دے دیا ہے۔

یادوں کی ایک اور شمع روشن ہے۔ کوہ مری میں مشاعرہ ہے' بارش ہو رہی ہے۔ چیڑھ کے درختوں کی خوشبو اڑ رہی ہے۔ کشادہ ہال میں قتیل شفائی اپنا کلام ترنم سے سنا رہے ہیں۔ ہر شعر پر ہال داد کی صداؤں سے گونج اٹھتا ہے۔ لاہور سے آنے والے شاعروں کو ایک مقامی سکول کے بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ قمر اجنالوی اچانک بیمار ہو گیا ہے۔ بیماری تشویش ناک ہے۔ میزبان پریشان پھر رہے ہیں۔ کوئی حکیم کی طرف تو کوئی ڈاکٹر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ قمر اجنالوی کی حالت دیکھ کر ظہیر کاشمیری کی طبیعت بھی خراب ہو رہی ہے۔ اس کے پاس سو کا نوٹ ہے جو وہ لاہور سے لے کر چلا تھا اور اس نے ایک ہزار ایک موقع آنے کے باوجود اسے نہیں تڑوایا تھا۔ قتیل شفائی کہہ رہا ہے کہ ظہیر کاشمیری کی خرابی طبیعت کا ایک علاج ہے کہ اس کا سو کا نوٹ تڑوا دیا جائے۔ ہم سب قمر اجنالوی کے لئے پریشان ہیں۔ وہ ہمارا دوست ہے۔ احمد راہی کہہ رہا ہے۔

"اے امرتسر والے حکیم گیانے شاہ کی معجون لا کر دو' ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔
"

میزبان شدید بارش کے باوجود ایک ڈاکٹر کو اٹھا کر لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ قمر اجنالوی کو ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ ظہیر کاشمیری نے منہ دیوار کی طرف کر لیا ہے۔ کھڑکی کے باہر رات کے اندھیرے میں کوہ مری کی بارش کا شور' حسین شور' میں اس شور کی خاموشی میں گم ہوں۔

ایک اور شمع روشن ہوتی ہے۔ سٹیج پر سے ایک اور پردہ اٹھتا ہے۔

میں رات کے وقت سائیکل پر سوار باغبان پورہ کی طرف سے آ رہا ہوں۔ میرے سائیکل کی بتی نہیں ہے۔ ایک سپاہی مجھے چالان کرنے کے لئے روکتا ہے۔ سائیکل سے اتر آتا ہوں۔ وہ کہتا ہے تم بغیر بتی کے رات کو سائیکل چلا رہے ہو۔ تمہارا چالان ہو گا۔ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔ وہ کاپی پنسل نکال کر پوچھتا ہے۔

"تمہارا نام"

میں کہتا ہوں۔۔۔ "قتیل شفائی"

وہ فوراً" آگے ہو کر پوچھتا ہے۔

کیا کہا۔ "حکیم شفائی"

پھر میں قتیل شفائی کے گھر کا پورا پورا ایڈریس لکھوا دیتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد قتیل سے ملنے "ادب لطیف" کے دفتر میں آتا ہوں۔ وہ چائے منگواتا ہے اور چائے بناتے ہوئے کہتا ہے۔

"میں نے مدت سے سائیکل نہیں چلائی اور مجھے سائیکل کے چالان کے سمن آئے ہیں۔"

میں چونک کر سر کھجانے لگتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔

"کسی کمینے نے چالان لکھواتے وقت میرا نام پتہ دے دیا ہے۔"

میں اسے کہتا ہوں "وہ کمینہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔" اور قتیل شفائی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتا ہے۔

پردہ گرتا ہے۔ پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔

ہم ایک اومنی بس میں بیٹھے مشاعرے میں شرکت کرنے جالندھر جا رہے ہیں۔ یہ مشاعرہ یوم اقبال کے موقع پر جالندھر میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی جانب سے کرایا جا رہا ہے۔ میں شاعر نہیں مگر مجھے امرتسر جانے کا شوق تھا' امرتسر کا کمپنی باغ دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ میرا بھی ویزا لگواؤ!

قتیل شفائی نے کہا۔

"میں اے۔ حمید کو اپنی غزل دے دوں گا۔"

ہماری اومنی بس امرتسر میں جی ٹی روڈ پر سے گزر رہی ہے۔ دوستوں میں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ میں امرتسر کے درختوں کو اداس نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ جالندھر میں قتیل اپنے سکھ دوست کے ہاں چلا گیا ہے۔ باقی شاعروں کو کسی اسکول میں ٹھہرایا گیا ہے۔ برف میں لگی بیئر کی بوتلوں سے بھری ہوئی بالٹی صوفی تبسم کے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ ہم سب بالٹی کے پیچھے کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ صبح میں اسکول کے سکاوے میں نہا کر نکلا تو قتیل شفائی آیا ہوا تھا۔ کہنے لگا:

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ یہاں تو نہانے کو بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

ایک شاعر نلکے کے نیچے دھوتی باندھے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے' پانی کی دھار اس کی ٹنڈ پر گر رہی ہے' وہ پتھر بنا ہوا ہے۔ قتیل نے مجھ سے پوچھا:

"اسے کیا ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا:

"رات ناصر کاظمی سگریٹ سے سگریٹ لگا کر پی رہا تھا اور یہ بیئر کی بوتل کے ساتھ بوتل لگا کر پی رہا تھا۔"

اب ایک پردہ مصری شاہ کے سٹیج پر سے اٹھتا ہے:

میں اور قتیل شفائی مصری شاہ کی رحیم روڈ پر کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ قتیل شفائی کا مکان میرے مکان سے آگے اس جگہ ہے جہاں مکانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے' اور کھیت شروع ہو جاتے ہیں' ان کھیتوں میں شہر کا کوڑا کرکٹ گڈوں میں بھر بھر کر پھینکا جاتا ہے۔ آپ اگر مصری شاہ کے پل سے نکل کر کوڑے کرکٹ

کے کسی ایک گڈے کے ساتھ ساتھ چل پڑیں تو پہلے میرا مکان آئے گا اور گڈے کا آخری سٹاپ قتیل شفائی کے مکان کے سامنے ہو گا۔ اس کی ایک بیٹھک یا ڈرائنگ روم تھا جو بہت سجا ہوا تھا۔ قتیل اپنی فیملی کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ قتیل کا مکان اور میرا مکان ہمارے ایک مرحوم دوست اقبال میر کا تھا۔ اقبال ادب دوست اور شعر کا عمیق فہم رکھتا تھا۔ اس کا اپنا مکان بھی اسی گلی کے آخر میں تھا۔ کبھی ہم تینوں اس کے مکان میں جا کر چائے پیتے اور شعر و سخن کی محفل گرم کرتے اور کبھی وہ قتیل کے یا میرے ہاں آ جاتا ہے۔ قتیل شفائی تانگے میں بیٹھ کر یہاں سے میکلوڈ روڈ جاتا۔ کسی روز میں بھی اس کے ساتھ چلا جاتا اور پھر میکلوڈ روڈ سے پاک ٹی ہاؤس آ جاتا۔ قتیل فلمی دنیا میں بے حد مصروف ہو چکا تھا اور اس کے فلمی گیتوں کی صدائیں بھارت اور پاکستان کی فضاؤں میں گونج رہی تھیں۔

قتیل شفائی پاکستان کے ایک ایسے علاقے کا رہنے والا ہے جسے میں پاکستان کے حسین ترین علاقوں میں شمار کرتا ہوں، یعنی ہری پور ہزارہ۔ میں پہلی بار ہری پور ہزارہ گیا۔ تو اس کی خوبصورتی اور حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں ایبٹ آباد جا رہا تھا کہ راستے میں گاڑی شاید پٹرول لینے یا انجن میں پانی ڈالنے کے لئے ہری پور ہزارہ رکی۔ میں نے یوکلپٹس کے تن آور گنجان درختوں کے جھنڈ اور لوکاٹ اور امرود کے باغ در باغ اور پتھریلے مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چشمے کے شفاف پانی کو بہتے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہری پور ہزارہ کے درخت اور پھلوں کے باغات دیکھ کر بے اختیار امرتسر یاد آ گیا۔ یہاں کے امرودوں پر یورپ کی میموں کا گمان ہوتا تھا۔ سرخ اور سپید گول امرود، یہ اس قدر نازک تھے کہ راولپنڈی تک کا سفر بھی گوارا نہ کر سکتے تھے اور راستہ میں ہی خراب ہو جاتے تھے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ زندگی کے چند سال اس خوبصورت خطے میں آ کر ضرور بسر کروں گا۔

لاہور واپس آ کر میں نے قتیل شفائی سے اس کے آبائی شہر کی تعریف کی کہ خدا کی قسم اگر میں ہری پور ہزارے کا رہنے والا ہوتا تو اتنی خوبصورت باغوں اور چشموں والی سرزمین چھوڑ کر لاہور کی آگ برساتی، گرد آلود سڑکوں پر کبھی نہ آتا۔ اگر

آتا بھی تو چند روز رہ کر واپس انہیں امرود اور لوکاٹ کے باغوں' یوکلپٹس کے درختوں اور ٹھنڈے شفاف پانیوں والے چشموں کی دنیا میں چلا جاتا۔ قتیل ہنستا رہا' یا اسے ہری پور ہزارہ کی قدر معلوم نہیں تھی یا ابھی اس نے ہری پور ہزارہ دیکھا نہیں تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی شہر اپنا آپ ان لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے جو وہاں کے رہنے والے ہوتے ہیں' وہ اپنا آپ چھپا جاتے ہیں۔

گلبرگ میں والڈ روف ہوٹل نیا نیا بنا تو وہاں ایک رات مہدی حسن کا گانا ہوا۔ دوسرے دوستوں کی طرح' میں اور قتیل بھی وہاں مدعو تھے' میں بیئر پی کر ہری پور ہزارہ کے درختوں' باغوں اور چشموں میں نکل گیا اور ہاتھ دھو کر قتیل کے پیچھے پڑ گیا کہ اگر وہ ہری پور ہزارے کا رہنے والا ہے تو اس نے اتنے خوبصورت شہر کے باغوں اور چشموں پر ابھی تک کوئی نظم کیوں نہیں لکھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ قتیل شفائی میری باتوں پر ہنس رہا تھا۔ مجھے اس کا مسکراتا ہوا چہرا آج بھی یاد ہے اور کچھ یاد نہیں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ جب تک میں نے قتیل سے چار آدمیوں کو گواہ بنا کر یہ وعدہ نہیں لے لیا کہ وہ ہری پور ہزارے پر ایک طویل نظم لکھے گا اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

قتیل شفائی ہری پور ہزارہ چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور میں آباد ہو چکا ہے۔ ہری پور ہزارے کے خوبصورت شہر نے ایک خوبصورت شاعر پیدا کر کے لاہور کو دے دیا ہے۔ اگر قتیل شفائی ہری پور ہزارے میں ہی رہتا تو یہ خوبصورت باغوں والا شہر قتیل کو سوائے امرودوں کے اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ جن کی طبیعت راولپنڈی آتے آتے خراب ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے قتیل کا لاہور آجانا حق بجانب ہے' مگر اب بھی کہوں گا کہ اسے ہری پور پر ایک نظم بلکہ پوری ایک مثنوی ضرور لکھنی چاہئے۔ یہ ہری پور ہزارہ کا اس پر حق ہے۔

ویسے قتیل شفائی کی نظموں' گیتوں اور غزلوں میں ہری پور کی ٹھنڈیاں چھاواں' چشموں کا ترنم' گرم دو پہروں میں لوکاٹ اور امرود کے باغوں سے آنے والی خوشبو' اور سبز آنکھوں والی جفاکش مٹیاروں کے کنگنوں کی کھنک موجود ہے۔ ہو سکتا

ہے اس کا قتیل شفائی کو علم نہ ہو، کیونکہ ہری پور ہزارہ کے گھنے درختوں اور باغوں میں ایک جادو ہے ایک سحر ہے جو بہت طاقتور ہے اور قتیل اس سے نہیں بچ سکتا۔

قتیل شفائی رحیم روڈ سے اٹھ کر سمن آباد چلا گیا۔ یہاں بھی ہم سب آپس کے دوست کبھی کبھی اس کے مکان پر جاتے اور بالائی والی چائے پیتے، میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ قتیل خوش خوراک ہے۔ وہ اچھے کھانوں کا شوقین ہے اور دوستوں کو بھی اچھے کھانے کھلانے کا شوق رکھتا ہے۔

ریڈیو کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں، میں نے اسے فون کیا کہ پرسوں مشاعرے کی ریکارڈنگ ہے اور کوئی تازہ غزل لکھنا، اور میرے لئے لکھنا۔ میں تمہاری تازہ غزل تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں۔ اس نے بڑی خوبصورت غزل کہی جو سارے مشاعرے کی جان تھی۔

قتیل شفائی غزل میں اس کی روایت کو بھی نبھاتا ہے اور اسے نیا لہجہ اور نئی جہت بھی دیتا ہے، لیکن یہاں میں اس کے فن پر بحث نہیں کروں گا۔ یہ کام اس کے نقاد بہت کچھ کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ میں تو اس شخص کی بات کر رہا ہوں، جو قتیل شفائی ہے اور جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ بہت بڑا شاعر ہے۔ اگرچہ میں نے اسے کبھی شعر لکھتے خود نہیں دیکھا، اور نہ ہی اس نے کبھی میرے سامنے شعر لکھے ہیں۔ لیکن آپ بھی یقین کریں کہ وہ شعر خود لکھتا ہے، جیسے میں نے کبھی کسی کے سامنے افسانہ نہیں لکھا، مگر سب کو یقین ہے کہ میں خود افسانے لکھتا ہوں۔

سمن آباد کے ارد گرد آبادی پھیلنی شروع ہوئی تو قتیل شفائی، موجد اور احمد ندیم قاسمی نے ایک ایک پلاٹ خرید کر مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ قتیل اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس مکان کی بیرونی دیوار پر چھوٹے چھوٹے پتھر لگے ہیں۔ یہ وہ پتھر نہیں ہیں جو بچوں نے قتیل شفائی کو دیوانہ سمجھ کر اس پر پھینکے تھے۔ یہ پتھر قتیل نے اپنے شعر بیچ کر خریدے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ پتھر کھا کر شعر کہا کرتے تھے۔ کل جگ آ گیا ہے۔ مجنوں اگر اس زمانہ میں ہوتا تو اسے پتھر خود خرید کر بچوں کو دینے پڑتے کہ لو پیارے بچو! مجھے پتھر مارو۔ یقین کریں کہ مجنوں کو جب پتھر کا ایک

ٹکڑا سو روپے میں گھر پڑتا تو اس دیوانے کو ہوش آ جاتا' اور لیلیٰ ویلی سب بھول جاتا۔

قتیل شفائی پتھر کھانے والا مجنوں نہیں ہے' مکتب عشق میں اس نے داخلہ ضرور لیا تھا' مگر زیادہ درس نہیں لے سکا اور ایک ہی سمسٹر پورا کر پایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی لیلیٰ سے ملنے جاتا تو فون پر اسے پہلے سے اطلاع کر دیتا کہ اس کے لئے بھنا ہوا گوشت بنائے اور چونسہ آم برف میں لگا کر رکھے۔ رومی نے لکھا تھا۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما

اور قتیل کے لئے میں اس میں رومیؒ کی پاک روح سے معذرت کے ساتھ اتنی تحریف کروں گا کہ۔

مرحبا اے عشق خوش خوراک ما

کشمیری لال ذاکر

موسموں کا شاعر

لاہور میں میرے چار دوست ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، محمد طفیل، شریف کنجاہی اور قتیل شفائی۔

احمد ندیم قاسمی سے دوستی کے علاوہ میرا قلمی اور ہمسائیگی کا بھی رشتہ ہے۔ ان دنوں میں نوشہرہ میں تھا۔ ان دنوں قاسمی صحت کی خرابی کی وجہ سے اپنے گاؤں انگہ میں تھا جو نوشہرہ سے بہت قریب تھا۔ قاسمی کے بڑے بھائی محمد بخش میرے کولیگ بھی تھے اور اس طرح ہمارا ملنا جلنا اکثر رہتا تھا اور اس طرح قلمی رشتہ بھی قائم تھا۔ تقسیم کے بعد ہمسائیگی والا رشتہ تو قائم نہ رہا لیکن قلم کا رشتہ استوار ہوتا رہا۔ ابھی کچھ ہفتے پہلے قاسمی کا خط بھی آیا تھا۔

محمد طفیل سے میں آج تک نہیں ملا۔ لیکن خط و کتابت اکثر رہی اور میرے بہت ہی مقبول افسانے پہلی بار نقوش ہی میں شائع ہوئے۔ بلکہ بقول فکر تونسوی میرے افسانے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں چھپے اور ہندوستان میں بعد میں ڈائجسٹ ہوئے۔

شریف کنجاہی تو ایک طرح سے میرا بھائی ہے۔ تقسیم کے دوران میرے خاندان کے افراد کو کنجاہ سے گجرات کے رفیوجی کیمپ میں حفاظت سے اسی نے پہنچایا بلکہ ہماری بھینسیں بیچ کر رقم میرے چچا جان کو کیمپ میں دینے آیا تھا۔ تقسیم کے

بعد خط و کتابت ضرور رہی لیکن ایک دوسرے سے ملنا نہ ہوا۔ ادھر چند برس پہلے وہ چندی گڑھ بھی آیا لیکن میں ان دنوں ہندوستان سے باہر تھا' اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ ابھی پچھلے دنوں لاہور سے پنجابی کے کچھ ادیب ادھر آئے تھے۔ شاہین ملک' کنول مشتاق اور دلشاد ٹوانہ۔ ان سے شریف کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اب وہ پنجاب یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر گجرات چلا گیا تھا۔ ایڈریس انہیں معلوم نہیں تھا ورنہ نوٹ کر لیتا۔

لیکن قتیل شفائی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ادھر پچھلے دو برسوں میں اس نے مجھے لاہور آنے کے اتنے دعوت نامے بھیجے ہیں کہ اگر میں غم دوراں کے جھگڑے میں نہ الجھا ہوتا تو اب تک لاہور ہو آیا ہوتا۔

ہری پور ہزارہ کا یہ پٹھان آج سے بہت برس پہلے 'جب پاکستان وجود میں نہ آیا تھا۔ لاہور کے ویکلی پرچوں میں پیاری پیاری غزلیں چھپوایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی غزلوں کے ساتھ تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ ان دنوں میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ اردو کے پرچے بہت سستے تھے اور خاصی تعداد میں بھی چھپتے تھے۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پرچے خریدتا بھی تھا' مانگ کر بھی پڑھتا اور چرا کر بھی' جانے کس پرچے میں قتیل کی ایک غزل پڑھی تھی جس کا یہ شعر ذہن میں کھب گیا تھا۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

قتیل کی شاعری میں جو غنائیت' تازگی' نغمگی اور رتوں کا خوبصورت امتزاج تھا وہ بڑا من موہک تھا۔ جوان جوان شعر تھے جو اٹک کے دریا کے پانی جیسے ہنستے ہنساتے اور پھوار کی طرح ادھر ادھر بکھرتے بڑے پیارے لگتے تھے۔ رفتہ رفتہ قتیل میرا محبوب بن گیا اور اس سے میری ذہنی دوستی پکی ہو گئی۔

ملک تقسیم ہو گیا۔ دوستیاں اجڑ گئیں' دلنوازیاں ختم ہو گئیں۔ پیاری پیاری صورتیں یوں غائب ہوئیں' کہ پھر کبھی دیدار بھی نہ ہوا۔ فسادات کی آندھی نے رشتوں کے آشیاں یوں اجاڑے کہ تنکے بھی نظر نہ آئے۔ کچھ عرصہ ذہن کی حالت

ایسی رہی کہ ایک ایک دم مرگھٹ کا سماں تھا۔ بھیانک سکوت، ایک کڑا جمود، ایک ناقابل برداشت سناٹا۔ لگتا تھا اب اس کے بعد کچھ بھی ہونے والا تھا۔ اب نہ گھر بسیں گے نہ دل، نہ رشتے جڑیں گے نہ دوستیاں جنم لیں گی۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے دونوں ملکوں میں ادیب انسان دوستی کی قدروں کو استوار کرنے میں مصروف رہے۔ ادھر کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راما نند ساگر، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، سلمٰی صدیقی، راجندر سنگھ بیدی اور بہت سے دوسرے فن کار اپنی تخلیقات سے میری قدروں کی آبیاری کر رہے تھے تو ادھر احمد ندیم قاسمی سعادت حسن منٹو، ممتاز شیریں، فیض احمد فیض، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، قتیل شفائی اور کئی دوسرے ادیب شاعر اور اس کام میں مصروف تھے بہت اچھی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں، بہت اچھی نظمیں کہی جا رہی تھیں۔ بڑے خوبصورت ڈرامے اسٹیج کیے جا رہے تھے۔ علاقے تو تقسیم ہو گئے تھے، لیکن دل تقسیم نہیں ہوئے تھے۔ پاکستان کی ادبی تخلیقات ہندوستان میں آزادی سے آ رہی تھیں اور یہاں کے ادبی رسائل اور کتابیں ادھر بھیجنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس لیے ستلج اور راوی کے ادھر اور ستلج اور راوی کے ادھر جو بھی ادب تخلیق ہو رہا تھا، اس میں سبھی فن کار شریک تھے۔ نقوش، سیپ، سنگ میل، نیا دور، فنون، شاہراہ، گفتگو، چندن، بیسویں صدی، شمع اور دوسرے کئی رسالوں میں دونوں ملکوں کے ادیب اور شاعر برابر چھپ رہے تھے۔ اب جیسا زمانہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے پاکستان میں چھپنے والے رسالوں کو ترستے ہیں اور پاکستان کے باسی ادھر کی تخلیقات کا دیدار تک نہ کر سکنے پر مجبور ہیں۔ اب تو کبھی ادھر سے کسی دوست کا خط آ جاتا ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ کئی بھولی بسری یادیں ذہن میں ابھر آتی ہیں۔ کئی کہانیاں مکمل ہو جاتی ہیں اور کئی خواب ایک بار پھر زندہ ہو اٹھتے ہیں۔

محمد طفیل جو لڑ جھگڑ کر افسانے منگوایا کرتا تھا اب میری خیریت بھی دوسروں سے پوچھتا ہے۔ شریف کنجاہی جس سے ایک عرصہ تک دن رات ساتھ رہنے کا رشتہ تھا اب صرف تحریروں میں نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جو ایک زمانے میں دل کی دھڑکن

کی طرح تھا' اب مہر بہ لب ہے- یا اللہ یہ کیسا اندھیر ہے! یہ کیسا انقلاب ہے! کیا ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دانوں کی یہی آرزو تھی' کہ ایک دن دونوں ملکوں کے عوام ایسے ہی دور میں جئیں؟ کبھی کبھی سوچتا ہوں تو دماغ ایک دم شل ہو کر رہ جاتا ہے- بہر حال یہ ناخوشگوار حقیقت ہمارے سامنے ہے اور ہم اس کی تمام تر تلخی اور کڑھن کے باوجود اسے تسلیم کر رہے ہیں کہ ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے-

میں بات کر رہا تھا تقسیم کے بعد کی فضا کی- اسی فضا میں کچھ کرنیں بھی پھوٹی تھیں- جب بٹوارے کے باوجود کئی برسوں تک دونوں ملکوں کے ادیب ادبی نشستوں اور مشاعروں میں ایک دوسرے سے ملتے تھے- کئی بار وہ جلسے بہت بڑے بھی ہوتے تھے اور کئی بار محفلیں مختصر بھی ہوتی تھیں- جام بھی کھنکتے تھے اور شعروں کے شعلے بھی لپکتے تھے- دل بھی دھڑکتے تھے اور لب بھی رقص کرتے تھے- ایک بار ایسا ہی ایک انڈو پاک مشاعرہ چیمسفورڈ کلب دہلی میں بھی منعقد ہوا- اس مشاعرہ میں پنڈت ہری چند اختر بھی موجود تھے اور قتیل شفائی بھی' اس مشاعرہ میں ہری چند اختر نے ایک بڑا ہی جوک کوک بڑے ہی کیوٹ انداز سے کیا تھا- دسمبر کا مہینہ تھا- خوب زور کا جاڑا تھا- چیمسفورڈ کلب کا وسیع لان سائبانوں اور قناتوں سے گھرا ہوا تھا روشنیوں کی سج دھج تھی- اگلی قطاروں میں بڑے خوبصورت صوفے لگے تھے جن پر نہایت ہی خوبصورت عورتیں بیٹھی تھیں- ان کے ہاتھوں میں کئی رنگوں کے اون کے گولے تھے- جو ادھر ادھر لڑھک جاتے تھے- انگلیاں سلائیوں پر تھرک رہی تھیں' سوئیٹر بنے جا رہے تھے- کہیں آغاز تھا' کہیں بالشت بھر بن چکا تھا- کہیں آدھا مکمل ہو چکا تھا اور کچھ اس قسم کی طلسمی فضا میں شاعر لوگ اپنا کلام سنا رہے تھے- جب کوئی بہت اچھا شعر پڑھا جاتا تو زوروں کی داد دی جاتی- لوگ خاصے ایکسائیٹ ہو جاتے لیکن اگلی قطاروں کے صوفوں پر بیٹھی خوبصورت عورتوں پر اس کا رد عمل صرف یہ ہوتا کہ ان کی انگلیوں کی سلائیوں پر تھرکنے کی رفتار تو بہت تیز ہو جاتی لیکن ہونٹ بالکل نہ ہلتے- پنڈت ہری چند اختر اسٹیج کی ایک طرف بیٹھے سارا سماں دیکھ رہے تھے- ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ پیتے دوسرے تھے' چڑھتی انہیں تھی' یوں سمجھئے کہ اس وقت

انہیں واقعی چڑھ گئی تھی۔ جب اس ذہنی کیفیت میں انہیں اپنا کلام پیش کرنے کے لئے کہا گیا تو مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر وہ سامعین سے یوں مخاطب ہوئے:۔

"اپنی غزل تو آپ کو ضرور سناؤں گا کیونکہ چیمسفورڈ کلب کے منتظمین نے مدعو کیا ہے اور معاوضہ بھی معقول دے رہے ہیں، لیکن غزل پیش کرنے سے پہلے شعراء حضرات کو ایک خوشخبری دینا چاہتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی پنڈال میں ایک دم خاموشی چھا گئی اور لوگ پنڈت جی کے اعلان کو سننے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ پنڈت جی پل بھر کو رکے اور بولے۔

"اگر داد دینے کا یہی انداز رہا تو مشاعرہ میں شرکت کرنے والے ہر ایک شاعر کو صبح تک ایک ایک سویٹر ضرور مل جائے گا۔"

یہ اعلان ہوا تو پنڈال میں قہقہے گونج اٹھے اور قہقہوں کی ان گونجوں میں اگلی قطاروں کے صوفوں پر بیٹھی خوبصورت عورتوں کے سلائیوں پر تھرکتے ہوئے ہاتھ ایک دم رک گئے اور اون کے گولے اور سلائیوں پر چڑھے سویٹروں کے حصے صوفوں کے نیچے ٹھونس دیئے گئے۔ اور پھر پنڈت جی نے غزل پڑھی، خوب داد حاصل کی، اب کی داد میں نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ان کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

لیکن داد تو لوٹی قتیل نے جب اس نے غزل کے اشعار اپنی مخصوص لے میں پڑھے تو حسین اور مترنم آوازیں جواب تک خاموش تھیں داد کی شکل میں فضا میں بکھر گئیں۔

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل اپنا مقدر غم سے بے گانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

قتیل نے آدھی رات گزر جانے کے بعد مشاعرے کی فضا میں شراب اور نمکی گھول دی تھی، جسے سبھی پی رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ مشاعرے کا ایسا مدہوش کن سماں بہت دیر میں دیکھنے کو ملا تھا۔

1956ء میں دہلی میں ایفروایشین رائٹرز کانفرنس تھی' وینو تھا وگیان بھون ادیبوں اور شاعروں کا ایک بہت بڑا بین الاقوامی جمگھٹ تھا۔ بہت اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے۔ بڑے اونچے اونچے ریزولیوشن پاس کیے گئے۔ بہت مشہور مشہور اہل قلم سے تعارف ہوا۔ اعجاز حسین بٹالوی بس جبھی ملے تھے' اس کے بعد نہ ان کے دیدار ہوئے نہ خط و کتابت ہوئی۔ مجھے یاد ہے پہلے دو سیشن کے بعد لنچ کی بات ہوئی تھی سوچا جا رہا تھا کہ لنچ کے لیے کہاں جایا جائے' کچھ طے نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک قتیل بولا

"یار' کاکے دے ہوٹل' چلو۔"

اور پھر قتیل' فکر تونسوی' اعجاز بٹالوی اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر' کاکے دے ہوٹل' آگئے۔ ان دنوں اس ہوٹل کی یہ شکل نہیں تھی جو اب ہے' ایک دکان سی قسم کا ڈھابہ تھا جس کے اندر چند چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ زیادہ میزیں باہر فٹ پاتھ پر پڑی رہتی تھیں اور زیادہ لوگ وہیں بیٹھتے تھے' گاہکوں کو انتظار بھی کرنا پڑتا تھا لیکن وہ کسی دوسرے ہوٹل میں نہیں جاتے تھے۔ ہم پہنچے تو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ہم چاروں پنجابی تھے اس لیے گفتگو پنجابی میں ہو رہی تھی'

"میں تے دہلی آ کے روٹی ایسے ہوٹل وچ ہی کھاناں واں۔" قتیل نے کہا۔

"کیوں؟" اعجاز کا سوال تھا۔

"فٹ پاتھ والا ہوٹل اے' ایس واسطے"" فکر نے جواب دیا۔

"اسی دو نویں وی تے فٹ پاتھے ادیب آں۔" میں نے فکر تونسوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

میرے اس جواب پر قتیل نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"طفیل تیری کہانیاں دا مجموعہ چھاپنا چاہندا اے' اجازت نامہ لکھدے۔"

"رائلٹی کس طرح ملے گی؟"

"میں لے لواں گا۔ طفیل یار آدمی اے۔"

پبلشروی کدے یار ہو سکدا اے؟" فکر بولا۔

"پریاروی تے پبلشر ہو سکدا اے فکر۔" قتیل کا یہ جواب ہماری گفتگو کا مقطع تھا۔ اس کے بعد تو ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر' کاکے دے ہوٹل' کے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے ہم سب کانفرنس کے بعد دوپہر والے سیشن اٹینڈ کرنے چلے گئے۔

قتیل سے ایک اور ملاقات!

گوڑ گانوہ میں (جو اب ہریانہ میں ہے) ایک انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ مشاعرے کا اہتمام کنور مہندر سنگھ بیدی نے کیا تھا جو ان دنوں وہاں ڈپٹی کمشنر تھے۔ قتیل پاکستان سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ طفیل ہوشیار پوری بھی تھا اور شاید حبیب جالب بھی' یہ آخری مشاعرہ تھا جس میں جگر مراد آبادی نے شرکت کی تھی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ جگر نے اس مشاعرے میں ایک بہت ہی مقبول غزل پڑھی تھی جس کا ایک شعر اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ پھول کھل تو سکے' کھل کے مسکرا نہ سکے

مشاعرہ کنور صاحب ہی کنڈکٹ کر رہے تھے' سب جانتے ہیں کہ مشاعروں کو کنڈکٹ کرنے کا کنور مہندر سنگھ بیدی کا اپنا ہی انداز ہے۔ نومبر کے آخری دن' آدھی رات کا سماں' چبھتی ہوئی ٹھنڈک' شراب پر ان دنوں اب جیسی پابندی نہ تھی' لیکن نریش کمار شاد پر ہم دوستوں نے پابندی عاید کر رکھی تھیں۔ اسے صرف ایک پیگ لینے کی اجازت تھی۔ (اگرچہ چھپ چھپا کر وہ تین چار پیگ مار ہی لیتا تھا) شاد کا نام اناؤنس کیا تھا' کنور صاحب نے اس سے پہلے کہ شاد مائیک کے سامنے کھڑا ہوتا کنور صاحب نے اس کے بارے میں اور اس کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ کہا' بڑا خوشگوار ماحول تھا شاد نے یہ قطعہ پڑھا۔

پتی پتی گلاب ہو جاتی
ہر کلی محو خواب ہو جاتی
تو نے ڈالی نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

شاد کی آواز مدھم تھی۔

کنور صاحب بولے "شاد اونچی آواز سے پڑھو بھائی۔"

نریش نے جواب دیا۔

"ایک پیگ پی کر تو اتنی ہی اونچی آواز میں شعر پڑھے جا سکتے ہیں۔"

پنڈال قہقہہ زار بن گیا۔

اور پھر قتیل شفائی کا نام اناؤنس ہوا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ تالیوں کی گونجوں میں ہی قتیل بڑے معشوقانہ انداز میں مائیک کے سامنے بیٹھ گیا۔ کنور صاحب قتیل کی شاعری کی تعریف کر رہے تھے اور وہ نئی نویلی دلہن کی طرح شرمائے جا رہا تھا۔

اور پھر اس نے خوبصورت انداز میں خوبصورت غزل پڑھنا شروع کی۔

گرمیِ حسرت ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام' ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

خنک رات کے تیسرے پہر میں ہلکی ہلکی آنچ رچنے لگی تھی۔ قتیل کی شاعری اور اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی گرماہٹ کی کیفیت ہے۔ ایسی گرماہٹ جو دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں آتش دان میں لکڑیاں سلگانے سے ڈرائینگ روم میں بیٹھے لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔ ایسی دھیمی دھیمی حرارت جو سرد موسموں میں سورج کی پہلی پہلی کرنوں سے الکسائے ہوئے رنگوں میں رچتی ہے اور ذہن میں ہلکا ہلکا سرور سا ہلکورے لینے لگتا ہے۔ کم سے کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے قتیل کی شاعری پڑھ کر اور اس سے گفتگو کر کے۔ کیا ان شعروں میں ایسی ہی کیفیت نہیں؟

میں لیے لیے پھرا ہوں غم زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں' کبھی تیری انجمن میں

سردار بھی پکارا' لب بام بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا' تیری دید کی لگن میں

ترس ترس کے مر رہی ہیں دل ہی دل میں حسرتیں
کہ جیسے بیگمات سیم تن حرم سراؤں میں

ٹوٹ گئے سیال نگینے' پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا' بات ہے یہ رسوائی کی

میرے خوابوں کے شبستاں میں اجالا نہ کرو
کہ بہت دور سویرا نظر آتا ہے' مجھے

ابھی تین روز پہلے قتیل نے مجھے اپنی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ "پیراہن" بھیجا

ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں قتیل کی شاعری کی کچھ نئی سمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، قتیل کی شاعری نے "ہریالی" سے لے کر "پیراہن" تک فن اور ادراک کی کتنی منزلیں طے کی ہیں اسے جاننا بھی ضروری لگتا ہے۔ "پیراہن" کی غزلوں کے کچھ شعر سنیے اور دیکھیے کہ اب قتیل کا فن پرواز کے کن آسمانوں میں اپنے پنکھ پھیلا رہا ہے اور اس پر سوچ اور تفکر کی کون سی راہیں کھل رہی ہیں۔ "پیراہن" کا ذکر کیے بغیر میری یہ تحریر یقیناً نامکمل رہتی،

اک اک پتھر جوڑ کے میں نے جو دیوار بنائی ہے
جھانکوں اس سے پیچھے تو رسوائی ہی رسوائی ہے

سورج ہے وہ تو اس کی پرستش ضرور کر
سایا ہے وہ تو شام کو ڈھلتا بھی دیکھ اسے

وہ پھول ہے اور خوشبوؤں میں پلا ہوا ہے
وہ جب کھلا تو کئی رتوں کا بھلا ہوا ہے

جس میں سورج کا طرف دار ہر اک سایا ہے
میں نے اس شہر میں گھر موم کا بنوایا ہے

تمام دن جو کڑی دھوپ میں بھی ختم نہ ہو
وہ کام شام کا پہلا ستارا کر جائے

کس نے دی آواز مجھے اک پیڑ کی سوکھی ڈالی سے
شاید یہ وہ موسم ہے جو بچھڑ گیا ہریالی سے

میری اونچائی تو میرے سر سے ہوتی ہے شروع
میرے قد میں ڈھونڈتے ہیں لوگ میرے ناپ کو

ایک اور ملاقات!

دہلی کا سپرو ہاؤس- آڈیٹوریم میں مشاعرہ تھا- فیض، قتیل اور ساحر تینوں موجود تھے- میں بھی ڈائس پر بیٹھا تھا' ایک طرف قتیل تھا' دوسری طرف فیض اور ساحر' ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ کرشن ادیب نے ایک تصویر اتار لی- وہ تصویر بہت دنوں تک میرے پاس رہی- پھر جانے قتیل اور فیض اور ساحر کا کون عاشق اڑا لے گیا' لیکن وہ تصویر آج بھی قتیل نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا رکھی ہے- یہ وہ زمانہ تھا جب قتیل پاکستان کی فلم انڈسٹری پر آہستہ آہستہ اپنی دھاک جما رہا تھا- پاکستان کے بہترین گانے والے اور والیاں اس کے گیت گاتی تھیں- خوبصورت آواز' پیاری پیاری اور دل میں اترنے والی شاعری- قتیل تو نغمہ نگار سے زیادہ فلمی ہیرو بنتا جا رہا تھا- جو غزل اس نے سپرو ہاؤس کے مشاعرے میں پڑھی اور کے کچھ اشعار سنیے-

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو' تم کیا جانو' بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

وصل کی رات نجانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

جتنے دن قتیل دہلی میں رہا بے حد مصروف رہا- ہر شام کوئی نہ کوئی محفل سجتی کبھی کسی کلب میں کبھی کسی انجمن کے اہتمام' میں کبھی "شمع" کے یونس صاحب' کبھی بیسویں صدی کے خوشتر گرامی اور کبھی دوستوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ' قتیل سب کا محبوب تھا- افسروں کا بھی سیاستدانوں کا بھی' ادیبوں کا بھی دوستوں کا بھی-

پچھلے برس جب قتیل ہندوستان آیا تو بہت دنوں بمبئی میں رہا۔ صابردت نے مجھے خطوں میں قتیل کی مصروفیات کی تفصیلات لکھیں تو جی خوش ہوا۔ اب قتیل ایک طرح سے فلمی شاعر بن گیا ہے' مزاج سے نہیں ویسے ہی' مزاج سے تو وہ پتھر ہے جواب تک اٹک کے دریا کے چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے پانی میں پازیب کی آوازیں سنتا ہے اور ستاروں سے گفتگو کرتا ہے اور چاند کی پرچھائیوں میں گاؤں کی دوشیزاؤں کو کھیتوں کی منڈیروں پر گھومتے دیکھتا ہے۔ اپنے محبوب کو ملنے جاتے ہوئے۔ قتیل دنیاوی طور پر کچھ بھی بن جائے لیکن ذہنی طور پر وہ وہی البیلا موسموں کا شاعر ہے جو کہتا ہے۔

جب کبھی چاند سے پگھلی ہوئی چاندنی برسی
اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے

بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے

قتیل سے میری یہی مانگ ہے کہ وہ وہی رہے جو کہ وہ ہے' فلموں کے لیے گانے لکھتے ہوئے وہ دوسرے شاعروں کی طرح فلمی مصرعوں کی ٹکسال نہ بن جائے۔ اس کے قلم کی نوک سے چاند اور ستارے تشکیل پائیں' صرف فلمی گانوں کے مکھڑے نہیں۔ جن کی چمک کبھی بھی ماند پڑ سکتی ہے۔

اس صدی کے بہت اہم شاعر قتیل شفائی

پھیلا ہے ترا کرب قتیل آدھی صدی پر
حیرت ہے کہ تو اتنے برس کیسے جیا ہے

اگر بات دوسرے مصرے سے شروع کی جائے تو میں آپ کو بتاتا ہوں، قتیل شفائی بھی شان سے آن سے تمکنت سے، عظمت سے، جلال سے اور جمال سے جیا ہے۔ (زبان و بیان پر انگلی دھرنے والے اس سے کو ...... کے ساتھ بنا کر پڑھ سکتے ہیں ......) قتیل شفائی ماشاءاللہ چوہتر برس کے ہو گئے ہیں۔ مگر وہ اب بھی مجھ ایسے لوگوں سے، جوان سے عمر میں کم و بیش بیس سال پیچھے ہیں، زیادہ صحت مند، زیادہ توانا اور زیادہ باعمل ہیں۔ اور یہ صحت جسمانی ہی نہیں قلبی اور ذہنی بھی ہے۔ وہ اب بھی ایسا پھڑکتا ہوا شعر کہتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں سے کوئی دھڑکتا ہوا پیغام انہیں پہنچ جاتا ہے۔ ان کے چودہ مجموعہ ہائے کلام کا ایک انتخاب چھپا ہے۔ انتخاب کی یہ کتاب پڑھ کر بمبئی کی ایک مینہ نے خط لکھا ہے اور تمام کتاب میں سے ایک شعر چھانٹ کر کہا ہے۔ لگتا ہے یہ آپ نے میرے لئے کہا ہے۔ قتیل جی، میں آپ کو سچ بتاؤں میری جب بھی اپنے شوہر سے لڑائی ہوتی ہے، اس وقت میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں، اور آپ بہت یاد آتے ہیں۔ آپ کب آ رہے ہیں،

یہ نہیں کہ قتیل صاحب کو اپنے معاملات کی تشہیر مقصود ہے۔ وہ تو اب بہت محتاط ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ پچاس سال سے ان کی زندگی کی رفیق ...... ان کی بیوی

اب ان سے بہت مطمئن ہو گئی ہے۔ یہ خط یا ایسی ہی کچھ اور باتیں قتیل صاحب مجھے صرف اس لئے بتا دیتے ہیں کہ میں ان کا ہم راز ہوں اور ان کے خیال میں ان کا ہم مسلک بھی ہوں۔ قتیل صاحب سے میری نیاز مندی کے پینتیس سال ہونے کو آئے ہیں۔ یہ ان کا کرم ہے' ان کی بڑائی ہے کہ وہ اسے دوستی کا نام دیتے ہیں۔ ہماری پنجابی زبان میں ایک محاورہ ہے۔"یا--راہ پیاں جانیئے یا واہ پیاں۔" مطلب یہ کہ کسی کی خوبیاں اور خامیاں یا تو ہم سفری میں کھلتی ہیں یا پھر واسطہ پڑنے پر۔ ان 35 پینتیس برسوں میں میں نے قتیل شفائی کے بہت سے رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں۔ ان کے ساتھ سفر بھی کیا ہے۔ دو دو ہفتے تک اکٹھے رہنے کا موقع بھی ملا ہے اور یہ کہ ان کے ساتھ "واسطہ" بھی پڑا ہے۔ واسطہ' یوں کہ' ان سے جب بھی کوئی کام آ پڑا انہوں نے اپنے دسیوں کاموں کو موخر کیا' اور پہلے میرا یا کسی بھی دوست کا کام نبٹایا۔

میں نے انہیں دوست کی حیثیت سے' باپ کے طور پر ____ شوہر کے روپ میں اور شاعری کے عالم میں' ہر ہر انداز سے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ فرشتہ نہیں ہیں۔ انسان ہیں اپنی خوبیوں کے علاوہ خامیوں سمیت' مگر انسان بڑا آدمی تب بنتا ہے' جب اسے اپنی خامیوں کا احساس ہو یا اسے احساس دلایا جائے تو اسے تاسف ہو۔ بڑا (یا عظیم) شاعر ہونا شاید' خدا کی عنایت ہے مگر بڑا انسان ہونا' خود آدمی کی اپنی ریاضت ہے۔ قتیل شفائی برسوں کی کٹھالی میں گھل کر' ڈھل کر کندن جیسے انسان بن چکے ہیں۔ کبھی انہیں کسی بات کے بارے میں کہیں کہ قتیل صاحب میرا خیال ہے' آپ نے فلاں معاملے میں غلطی کی ہے تو قتیل صاحب ایک لمحے کے لئے پلکیں جھکائیں گے' معاملے کو سمجھیں گے اور فوراً" برملا معذرت کریں گے۔ ابھی پچھلے دنوں وہ اپنی "کلیات" کے پروف دیکھ رہے تھے۔ میں قریب بیٹھا تھا اور شعروں کے کیف سے سرشار ہو رہا تھا۔ کسی ایک لفظ پر میں ٹھٹک گیا۔ بڑے ادب سے میں نے گزارش کی کہ قتیل صاحب اس لفظ کی صحت پر مجھے شک ہے۔ کوئی عام اور بزعم خود بڑا شاعر ہوتا' تو مجھے بڑے قرینے سے ڈانٹ دیتا۔ قتیل صاحب فوراً" اٹھے اور ایک چھوڑ دو تین لغات اٹھا لائے اور جب تک ہم دونوں مطمئن نہ ہو گئے' انہوں

نے یہ مشق جاری رکھی۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے' یہ عظمت کی بات ہے۔

قتیل شفائی کی شاعری کی بات یا شاعری پر بات بعد میں ہو گی۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو یا پر تو دیکھنا اصل بات ہے۔ کسی عظیم فنکار کی ذاتی زندگی اور شخصیت کیا ہے اور کیسی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے مداحوں کے لئے' نیاز مندوں کے لئے اور عقیدت کیشوں کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے قتیل شفائی کی دوستیاں بھی دیکھی ہیں اور دشمنیاں بھی۔ ان کی محبتوں کے جلوے بھی دیکھے ہیں اور ہجر میں تڑپنے کا سماں بھی۔ تڑپنے سے یہ مراد نہ لی جائے کہ وہ چاک گریباں' خاک بہ سرنالہو شیون کر رہے ہوں گے۔ جب وہ بے اختیار ہو کر اپنے ماضی کا حال سناتے ہیں۔ کبھی چندر کانتا کبھی بانو کبھی کسی آفتاب صفت اور کبھی کسی چاند کے کرنوں جیسی عورت کا ذکر کرتے ہیں' تو مجھے ان کے لہجے میں درد کی ہوک اور ہجر کی کوک صاف سنائی دے رہی ہوتی ہے۔ یہ ابھی پچھلے برس کی بات ہے' دوبئی کے ہوٹل کے ایک کمرے میں برسوں سے چھوڑی ہوئی بانو سے ان کی ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت کمرے میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ خواتین وحضرات' مگر یہ دونوں یوں آس پاس سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن تھے' جیسے کوئی ٹین ایجر لورز ہوں۔ اور جب رات صبح کے دامن میں اترنے والی تھی اور ہم اپنے کمرے میں سونے آئے تو قتیل صاحب نے اعتراف کیا۔ شاعری کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے لئے ایسے رومانوی لمحوں کی بڑی اہمیت (اور ضرورت) ہوتی ہے۔ کسی ایسے لمحے ہی میں قتیل شفائی نے اپنی وہ مشہور نظم کہی تھی۔۔

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

اور اسی مردوں جیسے نام والی عورت کو قتیل شفائی اب بانو کہنے لگے ہیں۔ ان ایک غزل کا ایک مصرع ہے۔۔

کہیں نام اس کا بانو کہیں چندر کانتا ہے

چندر کانتا قتیل شفائی کی پہلی (اور آخری) محبت تھی۔ آخری ان معنوں میں، کہ وہ ان کے تمام تعلقات، ان کی تمام محبتوں اور ساری دل بستگیوں پر آج بھی حاوی ہے۔ وہ کہتے ہیں مجھے محبت کی لذت سے اسی نے آشنا کیا تھا۔

میں نے اوپر کہیں بتایا ہے کہ اب ___ قتیل شفائی کی بیگم ان سے بہت مطمئن ہے۔ اب پہ زور میں اس لئے دے رہا ہوں کہ اب سے پہلے اپنی بھرپور اور خوشگوار متاہلا نہ زندگی میں اگر قتیل شفائی کو کبھی لوہے کے چنے چبانے نے پڑے تو اپنی انہی بے اعتدالیوں پر۔۔ کہ کبھی مردوں جیسے نام والی عورت سے تعلقات کی خبریں گھر تک پہنچ گئیں، کبھی بیوی کو کسی مشاعرے کی بھنک پڑ گئی کہ وہاں قتیل شفائی بسمل ہوتے رہے ہیں یا کوئی اور ایسی واردات۔۔ تو پھر گھمسان کی جنگ ہوتی اور قتیل شفائی کو یوں پسپا ہونا پڑتا کہ انہوں نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے، ان کی بیوی نے ان کے ساتھ تو کمال عزت اور محبت سے زندگی نباہی ہے۔ بلکہ آجکل تو قتیل شفائی اپنی بیوی کی باقاعدہ نازبرداریاں کرتے ہیں اور کہتے ہیں میں گئے دنوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔

اتنے برسوں کی دوستی کے بعد میں قتیل شفائی کے گھر کا ایک فرد بن چکا ہوں۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا نوید قتیل (جو بہت اچھا گلوکار ہے اور جس کے نغموں کے دو کیسٹ تیار ہو کر مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔) میرا اتنا ہی بے تکلف دوست ہے، جتنے قتیل شفائی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، یہ بھی قتیل شفائی کی تربیت، شخصیت اور محبت کا کمال ہے۔ ان کا پورا گھر محبت کا مامن ہے۔ ایک ایسا ماحول ہے کہ قتیل شفائی کی شام کی محفلوں میں ان کا داماد خورشید بھی ساتھ شریک ہوتا ہے اور ان کی بہو ارم یوں قتیل شفائی کے دوستوں کی آؤ بھگت کرتی ہے، جیسے اسی گھر کی پلی بڑھی بیٹی ہو۔ ان کے نواسے نواسیاں پوتے پوتیاں بھی جانتے ہیں کہ بابا کے کون کون سے قریبی دوست ہیں اور ان سے کتنا پیار لینا اور پیار کرنا ہے۔

میں آپ کو ایک تازہ واقعہ سناتا ہوں۔ پچھلے دنوں قتیل شفائی بمبئی میں وہاں کی فلموں کے لئے گیت لکھنے گئے ہوئے تھے۔ بعد میں مجھے بھی جانا تھا اور وہاں کچھ مشاعروں میں قتیل شفائی کے ساتھ شرکت کرنا تھی۔ بمبئی سے ان کا فون آیا کہ آتے

ہوئے ان کے گھر سے غزلوں کی کلیات اور انتخاب کی کچھ جلدیں لیتا آؤں۔ شام کے وقت میں ان کے گھر گیا۔ نوید گھر پر نہیں تھا۔ قتیل شفائی کی پوتی نے دروازہ کھولا۔ لپٹ کر ملی' اندر آیا تو میرے بیٹھنے سے بھی پہلے ارم نے پوچھا۔ انکل' آپ کھانا تو کھائیں گے نا۔؟ اور میرا جواب سننے سے پہلے ہی کہنے لگی' ٹھہریں "پہلے میں آپ کو گرم گرم سوپ پلاتی ہوں۔" چند منٹ میں سوپ بھی آگیا اور دو قسم کے سالن کے ساتھ توے کی تازہ تازہ چپاتیاں بھی آ گئیں۔ یہ قتیل شفائی کے اگر گھر کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ مہمان داری کی یہ وہ روایت ہے جسے پچھلے پچاس سال سے ان کی بیگم نے قائم رکھا تھا اب ان کی بہو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ قتیل شفائی کے ساتھ ایک تقریب میں ان کے گھر والے بھی موجود تھے۔ وہاں میں نے برملا اس کا اظہار کیا تھا کہ قتیل شفائی کے دسترخوان کے خیبر سے راس کماری تک چرچے ہیں مگر اس میں قتیل شفائی کی مہمان نوازی سے زیادہ ان کی بیگم کی عالی ظرفی اور وسیع القلبی کا ہاتھ ہے۔ چاہے ان کا آپس میں جھگڑا ہو۔ قتیل شفائی کا ہاتھ تنگ رہا ہو' وقت _ بے وقت دس مہمان آگئے ہوں' بیگم قتیل نے کبھی ماتھے پر سلوٹ نہیں ڈالنی بلکہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر خاطرداری کرتی رہیں۔ ایک حادثے میں بیگم قتیل کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ زیادہ متحرک نہیں' مگر اب بھی گھر میں ان کی برکت کا نور پھیلتا رہتا ہے۔

قتیل شفائی کی بیگم سکینہ بالکل ان پڑھ ہیں' ابھی پچھلے دنوں میں نے ان سے پوچھا' بھابی آپ یہ بتائیں' ٹیلی ویژن کے مشاعروں کے ذریعے' کتابوں رسالوں کے حوالے سے یا ان کے نغموں کو سن کر کبھی آپ کو ان کے شعر اچھے لگے ہیں اور آپ کیسا محسوس کرتی ہیں۔ "بھابی نے ایک منٹ میں سوچ کر کہا۔ "ہاں اکثر اچھے لگتے ہیں۔ اور بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔" اس وقت بھابی کی آنکھوں میں پوری محبت کی سرشاری گھلی ہوئی تھی۔ میں آپ کو بتاؤں۔ قتیل شفائی کی بیوی بہت خوبصورت تھیں (اب بھی ہیں بڑھاپے اور علالت کے باوجود ان کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی ہے) چندر کانتا کو میں نے نہیں دیکھا۔ یہ قتیل شفائی کا 47 '48ء کے زمانے کا عشق ہے مگر

بانو وغیرہ سب محبوباؤں کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یقین مانیئے۔ یہ ساری کی ساری سکینہ قتیل شفائی کے تلوے جیسی بھی نہیں۔ یہ مبالغہ نہیں، میں سچ عرض کر رہا ہوں۔ مگر شاعر کا کیا ہے اسے تو پھسلنے کے لئے، رپٹنے کے لئے کوئی بہانہ چاہیے اور کہتے ہیں نا۔۔ چوری کا گڑ میٹھا ہوتا ہے۔

جمال ہم نشیں کیسے اثر کرتا ہے۔ بیگم قتیل اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو تیس پینتیس برس سے ولایت جا کر آباد ہو گیا ہے، ایک بار بہت بے تاب ہو رہی تھیں۔ وہ گھر والوں سے کہہ رہی تھیں کہ اگر پرویز نہیں آتا تو آپ لوگ مجھے اس کے پاس بھیج دیں۔ پھر اسی بے قراری میں پنجابی زبان کے چند مصرعے کہے جنہیں سن کر قتیل شفائی بھی پھڑک اٹھے اور زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ باقاعدہ وزن میں تھے۔ قتیل شفائی کا ایک نام نہاد شاگرد ہے۔ نام نہاد میں نے اس لئے کہا کہ اس کا دعویٰ ہے، بلکہ وہ سر محفل اعلان کرتا ہے، مگر قتیل شفائی نہیں مانتے، ہنس کر یا سنجیدگی سے ٹال دیتے ہیں کہ آپ میرے دوست ہیں، شاگردی استادی کیا ہوئی۔ اس شاگرد کا صحافت سے بھی تعلق ہے اور وہ ایک روزنامے میں روزانہ قطعات بھی لکھتا ہے۔ قتیل شفائی اکثر جھنجلاتے رہتے ہیں کہ اس کے بیشتر قطعات بے وزن یا بے بحر ہوتے ہیں۔ قتیل شفائی اسے کہتے رہتے ہیں کہ بھائی۔۔ اگر روز مجھ سے ملنا ممکن نہیں تو ٹیلی فون کر کے چھپوانے سے پہلے قطعہ سنا دیا کرو۔ مگر وہ شاگرد جو اب بزعم خود استاد بھی ہے، یہ بات نہیں سمجھتا۔ میں نے جب بیگم قتیل کے "باوزن" شعر سنے تو ہنس کر قتیل صاحب سے کہا آپ کا وہ شاگرد بھابی کو آپ کے ناتے سے استانی جی کہتا ہے۔ اسے کہیں، آپ کو نہیں تو استانی جی ہی کو اپنے قطعات دکھا لیا کرے۔

قتیل شفائی بہت حاضر دماغ اور حاضر جواب ہیں، ایسا برمحل جملہ کہیں گے کہ جس پر زد پڑتی ہو، وہ بھی لطف سے بے حال ہو جائے۔ مگر کمال یہ ہے کہ اسی حوصلے سے خود پر آنے والے فقرے کو برداشت بھی کر لیتے ہیں۔ دو سال ادھر کی بات ہے۔ قتیل شفائی کی سالگرہ کے دن 24 دسمبر کی شام کو، ہم دو چار دوست قتیل شفائی کے گھر بیٹھے تھے کہ کشور ناہید کیک لے کر آئی اور احمد ندیم قاسمی نے قتیل صاحب کو شیئر

قلم کا سیٹ تحفے میں دیا۔ میں نے کہا۔ "بھئی قتیل صاحب اب آپ کو بھی لکھنا آ جائے گا۔" قتیل صاحب کھل کر ہنسے اور ندیم صاحب مسکرا پڑے۔ یہ واقعہ بعد میں خود قتیل صاحب نے کئی دوستوں کو کئی بار سنایا۔

قتیل شفائی ترقی پسند تحریک کے زبردست فعال رکن تھے۔ انہوں نے اس نظریے اور سوچ کو پوری شدت سے اپنایا مگر خوبی یہ رہی کہ اپنی شاعری کو (بیشتر شاعروں کی طرح) نعرہ نہیں بننے دیا۔ اگرچہ ہم لوگ خود کو بہت بڑا لکھا اور روشن خیال بتاتے ہیں، مگر المیہ یہ ہے کہ اب تک لوگ ترقی پسند کو کمیونسٹ کہتے اور کمیونسٹ کو نراکھرا دہریہ کہتے ہیں۔ قتیل شفائی کو گفتگو میں میں نے صرف دوبار جھنجلاتے دیکھا ہے۔ ایک جب کمیونزم یا کمیونسٹ کا ذکر آئے یا پھر جب کوئی احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ہلکی بات کردے، آپ بے شک قتیل شفائی کو بڑے دعوے سے کہہ دیں کہ آپ قطعی فضول شاعر ہیں (معذرت کے ساتھ) قتیل شفائی قہقہہ لگائیں گے اور نہایت بلاغت سے کہیں گے، شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں۔ لیکن اگر کہیں خدانخواستہ آپ نے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں صرف یہ کہہ دیا کہ قاسمی صاحب کی فلاں بات پسند نہیں۔ تو قتیل شفائی آپ کو بخشیں گے نہیں' وہ اتنی تندی سے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ یوں لگتا ہے' سننے والا اگر قائل نہ ہوا! تو تھوڑی دیر میں قتیل شفائی اسے گھائل کر دیں گے۔ قتیل شفائی کا یہ پٹھانی جوش اب شاید انہی دو معاملات پر ابال کھاتا ہے' ورنہ خود ندیم صاحب بتاتے ہیں کہ قتیل شفائی باقاعدہ لڑنے مرنے پر اتر آتے تھے۔ جب بھی کسی مشاعرے میں ہم لوگ گئے' قتیل شفائی نے ضرور لڑائی کی۔ حتیٰ کہ ایک بار ریلوے کے گارڈ کو تھپڑ مار دیا۔ اور یہ بات ندیم صاحب بھی بتاتے ہیں۔ اور خود میرے تجربے میں بھی آئی ہے کہ قتیل شفائی غلط بات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی ساری زندگی' ساری شاعری جھوٹ اور جبر کے خلاف لڑنے کا عنوان ہے اور اگر کوئی اور بھی ایسا کرتا ہے تو وہ اسے کھل کر داد بھی دیتے ہیں۔

مارشل لاء کے المناک اور شرمناک زمانے میں جب فیض اور حبیب جالب

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بین تھے' قتیل شفائی نے ریڈیو کے ایک لائیو پروگرام میں کھل کر حبیب جالب کو داد دی کہ "ہم جیسے سارے شاعر جب غزلوں سے دل بہلا رہے ہیں جالب ایک ایسا نڈر اور بیباک شاعر ہے، جس نے نہایت جرات اور دلیری سے قلم کو تلوار بنا رکھا ہے۔" قتیل شفائی' جالب مرحوم سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر اسی جالب نے جب اپنی طویل بیماری سے جھنجلا کر شاعروں' ادیبوں کے خلاف بیان دیا اور احمد ندیم قاسمی کو درباری شاعر کہا تو قتیل شفائی باقاعدہ اس سے الجھ پڑے۔ اور کافی عرصے تک جہاں دو چار ادیب شاعر ہوتے' قتیل شفائی اس مسئلے کو لے بیٹھتے اور بتاتے کہ احمد ندیم قاسمی کب کب ترقی پسند نظریات کی وجہ سے جیل میں گئے۔ کیسے آمر مطلق ضیاء الحق کے سامنے دھڑلے سے حق سچ کی بات کی۔

دہلی کے ہریانہ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں رات کو سوتے وقت قتیل شفائی نے خدا کو بڑی بے ساختگی اور سچائی سے یاد کیا۔ رحم کی بھیک مانگی۔ کرم کی التجا کی۔ دوسری صبح میں نے چھیڑنے کے انداز میں قتیل شفائی سے پوچھا۔ "آپ خدا کو مانتے ہیں۔؟" قتیل شفائی کو پتہ ہے کہ میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور رات کو تہجد کے لئے بھی اٹھتا ہوں' بلکہ ایک ایسے ہی موقعے پر انہوں نے احمد ندیم قاسمی صاحب کو ہنس کر کہا۔۔ "دیکھئے یہ شخص باز نہیں آتا۔ پھر نماز پڑھ رہا ہے۔" میرے اس وقت سوال پر قتیل شفائی نے ایک گہرا سانس بھرا اور کہا۔ کیوں نہیں۔؟ میں نے مذاق میں کہا۔ "آپ ترقی پسند اور کمیونسٹ جو ہوئے۔" اور پھر ہم دونوں کھل کر ہنس پڑے، قتیل شفائی کہنے لگے۔ میں پہلے صبح کی نماز پڑھ لیتا تھا۔ اب پھر جی چاہ رہا ہے' نماز بھی پڑھا کروں۔ اور اسی کمیونسٹ (دہریے) قتیل شفائی کا ایمان دیکھیں کیا کسی "اہل ایمان" نے ایسا اظہار کیا ہو گا......

تو نے سدا آس کے' مجھ میں جلائے دیئے
میری سیہ رات میں' تو نے اجالے کئے
کوئی بھی مشکل پڑی، پہنچا مدد کے لئے
جب بھی پکارا تجھے' تو نے سنی ہے پکار اے مرے پروردگار

کیوں نہ کروں میں تیری، حمد و ثنا بار بار اے مرے پروردگار

مجھ میں کہاں حوصلہ، حمد تری لکھ سکوں
میں تو تیرے نام پر، اشکوں کے تارے ٹکوں
اس کے لئے بھی مگر، تیری ہی جانب تکوں

یوں مرا ایک ایک شعر، بننے لگے شاہکار اے مرے پروردگار
کیوں نہ کروں میں تیری حمد و ثنا بار بار اے مرے پروردگار

قتیل شفائی کو تنگ نظر اور جاہل ملا سے اختلاف ہے۔ چڑ ہے، اس ملا سے جو دین کی ابجد بھی نہیں جانتا مگر دین کے نام پر منافرت پھیلا رہا ہے۔ وہی جسے اقبال نے بھی کہا ہے......

دین ملا فی سبیل اللہ فساد

جہاں وہ آمریت کے خلاف لڑتے آئے ہیں جبر کے خلاف سینہ سپرد رہے ہیں۔ وہیں ملا کی ژولیدہ بیانی کے خلاف بھی نبرد آزما رہے ہیں۔ اپنے مکمل اعتماد اور پورے ایمان کے باوجود کبھی کبھی وہ ملا کے انسٹی ٹیوشن سے "گھبرا" بھی جاتے ہیں۔ کہتے ہیں...

باتیں بہت قتیل مگر اس ڈر سے چپ ہوں
یہ واعظ دشوار نہ میرا جینا کر دے

قتیل شفائی مزاروں پر جانے والوں اور وہاں جا کر منتیں ماننے والوں کے بھی سخت خلاف ہیں، مگر لطیفہ یا لطف یہ ہے کہ ان کی بیگم بھی مزاروں کی ارادت مند ہیں اور میں بھی وہاں حاضری دیتا رہتا ہوں۔ ایسے میں قتیل صاحب تلملاتے ہیں۔ فقرے بازیاں کرتے ہیں مگر "کر" کچھ نہیں سکتے۔ ایک روز ان کی بیگم نے داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دینا تھی۔ گھر سے سب اکٹھے نکلے۔ قتیل صاحب نے کہا۔ آپ لوگ مجھے راستے میں اظہر جاوید کے دفتر میں چھوڑ جائیں۔ گھر والے چلے گئے اور قتیل

شفائی بڑ بڑاتے رہے-- کچھ دیر بعد بھابی آ گئیں- قتیل صاحب نے پھر طنزیہ جملے کہے میں نے کہا- "دیکھیں قتیل صاحب، مجھے پتہ ہے آپ نے احمد ندیم قاسمی سے کبھی اصلاح نہیں لی- مگر آپ انہیں استاد سے بھی آگے کا درجہ دیتے ہیں، ان سے آپ کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ آپ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے- بھابی کا اپنا عقیدہ ہے اور عقیدت ہے انہیں کرنے دیں- وہ جو کچھ کرتی ہیں، آپ کیوں اعتراض کرتے ہیں" پھر میں نے بھابی سے مخاطب ہو کر کہا- "آپ نے جب بھی داتا دربار جانا ہو، آپ یہاں آجایا کریں یا مجھے فون کر دیں- بھابی بہت مسرور ہوئیں اور قتیل شفائی بھی مسکر کر چپ ہو رہے یا چپ ہو کر مسکراتے رہے- قتیل شفائی کہتے ہیں-

انسان یہ سمجھے کہ یہاں دفن خدا ہے
میں ایسے مزاروں کی زیارت نہیں کرتا

مفلس کے بدن کو بھی ہے چادر کی ضرورت
اب کھل کے مزاروں پہ یہ اعلان کیا جائے

قتیل شفائی کی اس حقیقت پسندانہ سوچ سے کون اختلاف کر سکتا ہے- میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں- مگر مزاروں پر میری حاضری کا "مقصد" کچھ اور ہوتا ہے- قتیل شفائی بھی اس معاملے کو سمجھ گئے ہیں- وہ دوستوں کی محفل میں میری اس عادت پر فقرے بازی تو کرتے ہیں، مگر جب ہم چنڈی گڑھ کے مشاعرے سے واپسی پر پانی پت سے گزرے تو میں نے حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے مزار پر حاضری دینے کی خواہش کی- قتیل شفائی نے کہا، ہم بھی چلیں گے- اور اس ہم میں مرحوم حبیب جالب بھی شامل تھے- بو علی شاہ کے مزار کے احاطے میں دروازے کے پاس ہی الطاف حسین حالی کی قبر ہے- وہاں فاتحہ خوانی کر کے قتیل شفائی زیادہ خوش نظر آتے تھے- بمبئ میں سمندر کے تھوڑا سا اندر ایک بزرگ حاجی علی کا مزار ہے، قتیل شفائی وہاں بھی مجھے لے کر گئے- خود تو صابردت کے ساتھ ایک قریبی ریستوران میں چائے

پیتے رہے، میں اپنی حاضری دے آیا- وہیں ماہم میں قتیل شفائی کے عزیز ہیں- وہاں گئے تو کہنے لگے- یہاں قریب ہی ایک بزرگ کا مزار ہے- آپ ہو آئیں- کھانا بعد میں کھائیں گے-

ان واقعات سے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ قتیل شفائی اپنی واضح، کھری اور مثبت سوچ رکھنے کے باوجود دوستوں کی پسند سے اختلاف نہیں کرتے- بلکہ زیادہ سے زیادہ انہیں مواقع دیتے ہیں- کئی نظریاتی طور پر رجعت پسند لوگ، قتیل شفائی کے حلقہء اثر میں ہیں، مگر وہ ان سے دوستی نبھائے چلے آ رہے ہیں، نظریاتی اختلافات سمیت-- قتیل شفائی دوستوں کی باقاعدہ ناز برداریاں کرتے ہیں- انہیں یاد رہتا ہے کہ میں دوپہر میں کھانا نہیں کھاتا- اور چائے زیادہ پیتا ہوں- وہ اپنے کھانے کے ساتھ میرے مزاج کا بھی خیال رکھیں گے ہم پردیس میں ہو یا دیس میں- قتیل صاحب کے گھر میں بیٹھے دوستوں کا مجمع ہو اور سب اپنے شغل میں لگے ہوں تو گھڑی کی طرف دیکھ کر قتیل صاحب چونکیں گے اور کہیں گے، آپ کو بھوک لگی ہو گی- آپ پہلے کھانا کھا لیں- کھانا ہو چکے گا، تو میرے لئے چائے کے لئے فکر مند ہوں گے- میں ایک بات علی الاعلان سارے ادبی حلقوں میں اور اپنے تمام سینئرز احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا اور اشفاق احمد سے کہتا ہوں، کہ وضع داری نبھانا کوئی قتیل شفائی سے سیکھے- انہیں زندگی بھر مجھ سے کوئی کام نہیں رہا مگر سالہا سال سے ہوتا آ رہا ہے کہ وہ ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے دن میرے دفتر کا ضرور چکر لگا جاتے ہیں- مصروفیات کی وجہ سے یا سواری نہ مل سکنے پر گھر سے نکل نہ سکے ہوں تو فون کر کے حال چال پوچھ لیں گے- یہ چھوٹی چھوٹی وضع داریاں اور دوست نوازیاں ہی انسان کے بڑے ہونے کا بین ثبوت ہیں-

قتیل شفائی شاعر کتنے عظیم ہیں--- تو احمد ندیم قاسمی، فیض اور فراق کی رائے کے بعد میں کیا عرض کر سکوں گا- احمد ندیم قاسمی نے بھرے مجمعے میں کہا تھا- "قتیل شفائی اس صدی کے بہت اہم شاعر ہیں-" اور فرط جذبات سے قتیل شفائی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے-

قتیل شفائی بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔ عمر بھر جدوجہد کی ہے اور صحیح معنوں میں دس ناخنوں کی کمائی سے زندگی گزاری ہے۔ ان کے والد ہری پور کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کی وفات کے بعد قتیل شفائی نے بہت تھوڑے عرصے میں ساری جائداد ٹھکانے لگا دی اور ساٹھ روپے ماہانہ کی نوکری سے اپنی اصل زندگی کا آغاز کیا۔۔ وہ حادثوں سے گزرے' بیروزگاری کا سامنا رہا تنگ دستی کا زمانہ دیکھا۔ لیکن کسی نے ان کی خوش پوشی اور خوش مزاجی میں فرق نہیں دیکھا ہو گا۔ پانچ بچوں کو ٹھاٹ سے پالا۔ دو بیٹیوں کی عزت اور شان سے شادیاں کیں۔ نواسوں' پوتوں کو سینے سے لگایا اور دوستوں کے علاوہ عزیزوں رشتہ داروں کی بھی ہمیشہ مدد کی' لیکن میں نے انہیں پریشان اور متفکر کبھی نہیں دیکھا۔ واقعی خدا ان کی سنتا ہے۔ ان کی نیک نیتی کے طفیل انہیں بہت نوازتا ہے۔ میں پہلے کہتا تھا کہ میں نے اس چٹان سے جیسے ٹھوس شخص کو دو بار پگھلتے تھے اور آنسو بہاتے دیکھا ہے' ایک چند سال پہلے جب ان کی اکلوتی ہمشیرا انتقال کر گئی تھی اور دوسرے جب احمد ندیم قاسمی نے ان کی بے مثال تعریف کر دی تھی۔

اس نومبر93ء میں ایک رات ایسی بھی آئی کہ میں نے قتیل شفائی کو ہچکیوں سے روتے دیکھا۔ دہلی میں نارنگ ساقی کے گھر رات گیارہ بجے جب ہم ایک بھرپور محفل سے اٹھ کر آئے تو نارنگ ساقی کے بیٹے نے بتایا کہ لاہور سے فون آیا ہے آپ کے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ قتیل شفائی سکتے میں آ گئے فوراً" لاہور فون ملایا گیا اور جب قتیل شفائی نے اپنے بیٹے نوید سے بات کی اور کہا۔ "چاچے دا انتقال ہو گیا اے ؟" تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ بھائی کا لاہور سے بھی دور ہری پور میں انتقال ہوا تھا اور اس وقت صورت حال یہ تھی کہ دہلی سے واپسی کا کوئی فوری امکان نہیں تھا۔ پی آئی اے کی فلائٹ دو دن بعد تھی اور اس میں سیٹ ملنا قریباً" ناممکن تھا۔ وہ کرب کا زمانہ قتیل شفائی نے کیسے گزارا' شاید میں تھوڑا بہت اندازہ کر سکتا تھا' ورنہ اس کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔

فراق گھورکھپوری نے لکھا تھا۔۔ "اس دور کے جن بہت کم شاعروں کو بھرپور

کامیابی نصیب ہوئی ہے' ان میں قتیل شفائی کا نام قابل رشک حیثیت کا مالک ہے۔ معلوم ہوتا ہے ترنم اور موثر نغموں کے زیر و بم قتیل شفائی کے لہو کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہو گا جہاں بہت بڑی تعداد میں لوگ قتیل شفائی کے نغمے نہ گنگناتے ہوں۔ حالانکہ ان نغموں میں سستی عمومیت کہیں بھی نہیں ہے' یہ سادگی و پرکاری' یہ بے خودی و ہشیاری ان نغموں کو امر بنا دیتی ہے۔ ان نغموں میں حیات بٹ رہی ہے۔"

فراق صاحب نے قتیل شفائی کی جس مقبولیت کا ذکر کیا ہے' اس کا میں بھی عینی شاہد ہوں۔۔ بمبئی میں وہاں کے ایک مشہور فلم ساز نے قتیل شفائی کو جوہر پر ایک پانچ ستاروں والے ہوٹل۔۔۔ "جو ہو" ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔۔۔ میں قتیل صاحب کے ساتھ تھا۔ فلم ساز گلشن کمار وہاں ملنے آیا تو قتیل شفائی سے کہا ___ آپ اپنے دوست کو بمبئی کی سیر کرائیں۔ میں کل گاڑی بھیج دوں گا جب آپ فارغ ہو جائیں گے' پھر گیتوں پر کام شروع کر لیں گے۔۔۔ اس سے پہلے میں اور قتیل شفائی انہیں بتا چکے تھے کہ میں نے ہفتہ بھر بمبئی میں رکنا ہے۔۔۔ دوسرے روز فلم ساز نے اپنی مرسڈیز کار بھیج دی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں ہندوستان میں مرسڈیز کسی کسی کے پاس ہوتی ہے۔ وہیں جو ہر ہوٹل کے قریب ایک لانڈری پر قتیل شفائی نے فلم ساز کمپنی کے پی آر آئی معرفت اپنے اور میرے کپڑے دھلنے کے لیے بھیجے۔ دو تین روز بعد میں ادھر سے گذرا تو وہ کپڑے لینے چلا گیا۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا' پرچی پر قتیل شفائی کا نام لکھا ہے۔ وہ بچارا غریب سا دھوبی بھک کر میری طرف آیا۔ آپ قتیل شفائی ہیں۔ ہم تو آپ کے بہت پریم کرنے والے ہیں۔ میں حیدر آباد دکن کا رہنے والا ہوں۔ اور شاعری بہت اچھی لگتی ہے اور سب سے زیادہ آپ اچھے لگتے ہیں ....."

ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ بددیانتی کر جاؤں اور قتیل شفائی بن کے ساری تعریف سمیٹ لوں۔ پھر میں نے اس نوجوان سے کہا۔۔ میں قتیل شفائی نہیں ہوں۔ وہ ساتھ والے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں تو کل واپس چلا جاؤں گا' آپ کسی وقت جا کر ان سے مل لینا"

پچھلے سال عرب امارات میں جشن قتیل شفائی منایا گیا۔ پہلے روز دبئی میں انڈوپاک مشاعرہ ہونا تھا۔ مقامی اخبارات میں قتیلؔ شفائی کی تصویر کے ساتھ اشتہار چھپا تھا۔ قتیل شفائی نوید قتیل، پرتو روہیلہ اور میں ہوٹل کے باہر نکلے، کار میں بیٹھنے سے پہلے ہم فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ ایک بڑی سی کیڈلک کار رکی۔ ایک شاندار عرب باہر نکلا اور لپک کے قتیل شفائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عربی اور انگریزی زبانوں میں کہنے لگا۔ "آپ قتیل شفائی ہیں۔ میں آپ کا نیاز مند ہوں یہاں کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔۔

ایسے دسیوں واقعات ہیں جن سے قتیل شفائی کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بمبئی ہی میں ایک شام نغمہ نگار آنند بخشی کا فون آیا۔ شکایت کرنے لگا کہ آپ نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں کی۔ پھر جذباتی ہو کر کہنے لگا۔ قتیل صاحب آپ پہلے بمبئی آئے تھے تو مجھے آدھا شاعر بنا گئے تھے۔ اس بار ملیں اور مکمل شاعر بنا جائیں۔۔ وہاں میں نے نغمہ نگار اندی ور کو دیکھا کہ وہ کس ادب اور احترام سے قتیل شفائی سے ملتا تھا۔ وہاں کی انڈسٹری والے اندی ور کو۔۔ کوی مہاراج کہتے ہیں۔ اور وہ قتیل شفائی کو اپنا گورو کہتا ہے۔۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی کتاب تلخیاں (یا شاید پرچھائیاں) کا ہندوستانی ایڈیشن بھیجا تو اوپر لکھا

"پاکستانی ساحر لدھیانوی کی نذر

ہندوستانی قتیل شفائی کا ہدیہء خلوص"

فیض احمد فیض نے لکھا۔۔۔۔۔۔ "قتیل صاحب ایک زمانے سے تحسین و توصیف کے محتاج نہیں۔ ان کا شمار ملک کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے اور ان کے کلام پر قبول عام کی مہر ثبت ہے۔ یوں تو انہوں نے بہت سی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس قبول عام کا سہرا غالباً" ان کی غزل ہی کے سر ہے۔ ہمارے دور میں اس ہزار شیوہ عروس سخنؔ کے کئی رنگ دیکھنے میں آئے ہیں۔ (عاشقانہ، فاسقانہ، فلسفیانہ، صوفیانہ، ظریفانہ، سیاسی، روایاتی تجرباتی وغیرہ وغیرہ) ان میں قتیل صاحب ایک ایسا منفرد رنگ رکھتے ہیں جس میں قریب قریب سب رنگوں کی جھلکیاں

ملتی ہیں لیکن رنگا رنگی کے باوجود ان کا کلام ایک رنگ ہے۔ اس یک رنگی میں لہجے کو بھی دخل ہے۔ معانی کو بھی۔"

"ان کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہے اور ان کی فکر ہمیشہ سے دردمندانہ۔ طرب اور درد کے درمیان جو بہت سے مقامات پڑتے ہیں۔ کوئی رنگین' کوئی ویران کوئی بارونق کوئی' اداس قتیل صاحب نے مختلف پیرایوں میں انہی کی منظر کشی کی ہے اور اس کاوش میں انسان دوستی اور امید فردا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔"

قتیل شفائی نے اپنے کلام کے انتخاب کی کتاب (جسے احمد ندیم قاسمی' خواجہ ذکریا اور شہزاد احمد نے مرتب کیا ہے) کے آخر میں لکھا ہے۔ "جوش' فراق' فیض اور ندیم نے میرے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے میری شاعری کو پسند کیا ہے اور مجھے کیا چاہیے۔ واقعی قتیل شفائی کو اور کیا چاہیے۔ بھرا پرا گھر۔۔ شہرت' عزت عظمت اللہ کیا دیا سبھی کچھ تو ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا۔ قتیل صاحب زندگی میں (یا زندگی کی) کوئی حسرت ہے۔؟ وہ کچھ دیر خاموش رہے' جیسے دور ماضی میں جھانک رہے ہوں۔ پھر بڑے اعتماد سے اور سچائی سے کہا۔ نہیں' اللہ کے فضل سے قطعی کوئی حسرت نہیں۔ میں نے جیسے چاہا' ویسی زندگی گزاری ہے اور کبھی زندگی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ "کوئی پچھتاوا" قتیل صاحب نے زوردار انداز میں جواب دیا۔ "الحمد للہ کوئی نہیں۔" میں نے چھیڑ خانی کی۔ "اور وہ جو لتا منگیشکر والی بات تھی۔؟" بہت زور سے ہنسے۔ "آپ کو تو ساری سچوایشن معلوم ہے۔ میری بیوی اور بیٹا نوید میرے ساتھ تھے" میں بھی معنی خیز انداز میں ہنس کے رہ پڑا۔

قتیل شفائی ایک مضمون یا عام سے انٹرویو کی گرفت میں آنے والے نہیں میں ان پر مکمل کتاب بھی لکھ دوں تو شاید پھر بھی آشنگی رہے۔ ان پر ہندوستان کی دو یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ ہو چکی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اور بہاولپور یونیورسٹی کی دو طالبات ان پر ایم اے کے تھیسس لکھ چکی ہیں' جن میں سے ایک کتابی صورت میں بھی چھپ گیا ہے۔ پورے برصغیر میں اس وقت بھی ان کی دو ہندوستانی فلموں "سر" اور "پھر تیری کہانی یاد آئی" کے نغمے گونج رہے ہیں۔ انڈیا کے اخباروں نے لکھا ہے

کہ ان نغموں کی ریکارڈ فروخت ہوئی ہے۔ یہاں پاکستان کی تین کیسٹ تیار کرنے والی کمپنیوں نے قتیل شفائی سے اجازت لئے اور رائلٹی دیئے بغیر ان فلموں کے کیسٹ بنا کر لاکھوں کی تعداد میں بیچ لیے ہیں۔ قتیل شفائی نے ان کیسٹ کمپنیوں پاکستان میوزک کارپوریشن اور سونک وغیرہ کو قانونی نوٹس بھیج رکھے ہیں۔ جن کا مقدمہ لاہور کی ایک عدالت میں زیر سماعت ہے۔

ہندوستان کی فلمی صنعت کے تخلیقی دیوالیہ پن کی تخلیقی دیوالیہ پن کا یہ عالم ہے کہ وہاں یا تو پرانی فلمیں دوبارہ بنائی جا رہی ہیں۔ یا انگریزی فلموں کے علی الاعلان چربے ہو رہے ہیں۔ اور یہاں تک کہ اب پاکستانی فلموں پر بھی ہاتھ صاف کیا جانے لگا ہے۔ ساحر لدھیانوی کی وفات کے بعد وہاں نغمہ نگاری میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے' جسے کوئی پر نہیں کر سکا۔ شکیل بدایونی اور راجیندر کرشن اپنے مخصوص مزاج کے شاعر تھے کوئی ان کا ثانی بھی پیدا نہیں ہو سکا۔ مجروح سلطان پوری شاید تھک گئے ہیں۔ اس وقت وہاں کی فلمی صنعت پر آنند بخشی اور سمیر کی حکمرانی ہے۔ آنند بخشی اگرچہ پھر بھی بہتر نغمہ نگار ہے۔ مگر سمیر نے تو تک بندی کی حد کر دی ہے۔ یہ پرانے نغمہ نگار انجان کا بیٹا ہے۔ ایسے میں بمبئی میں قتیل شفائی کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے' لیکن قتیل شفائی کا حال یہ ہے کہ انہی ہفتے عشرے بعد گھر یاد آنے لگتا ہے۔ ادھر فلم ساز گلشن کمار اور مہیش بھٹ کہتے ہیں' ہماری تین چار فلموں کے گیت مکمل کر کے جائیں' ادھر قتیل شفائی اڑنے کے لئے پر پھڑ پھڑا رہے ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "اصل بات بتائیں" سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "پاکستان جا کر چاہے میں ایک گیت لکھوں اور وہ بھی پنجابی زبان کا مجھے زیادہ سکون ملتا ہے۔!" میں نے کہا "قتیل صاحب' جب ساری دنیا میں آپ کا نام گونجتا ہے۔ چاہے انو رادھا پوڈوال اور کمار سانو کی آواز میں۔ نام تو پاکستان کا سربلند ہوتا ہے۔ قتیل صاحب نے حامی بھری "ہاں یہ تو ہے۔ آپ کہتے ہیں تو میں اور کچھ دن رک جاتا ہوں"

بھارتی فلمی صنعت اس بے یقینی اور ٹوٹ پھوٹ کے دنوں میں پاکستان کی طرف دیکھ رہی ہے اور پاکستان کے سدا بہار نغموں کو "دبوچ" لینا چاہتی ہے۔ قتیل

شفائی سے پہلی فرمائش ہوتی ہے۔ ہمیں اپنا فلاں گیت دے دیں۔ قتیل صاحب کہتے ہیں "میں اتنا سمجھوتہ کر لیتا ہوں۔ وہاں نئے اچھے گیت تخلیق کرنے کے لئے انہیں اسی طرح "بہلانا" بھی ضروری ہے۔ بھارتی فلم ساز اور موسیقار یا تو قتیل صاحب کے پرانے گیتوں کو پرانی دھنوں سمیت قبول کر رہے ہیں یا پھر وہ دھن اپنی بنا لیتے ہیں۔

دل دیتا ہے رو رو دہائی.........

کی دھن بھی پرانی ہے مگر انو ملک نے "پھر تیری کہانی یاد آئی" کے لئے

"تیرے در پر صنم چلے آئے"

کی نئی دھن بنائی ہے، مجھے بھی ......(اور لوگوں کی طرح) یہ دھن اچھی نہیں لگی مگر انڈیا اور باہر یہ گیت "ہٹ" قرار پایا ہے۔ قتیل صاحب کا خیال ہے کہ ہم گزشتہ بیس پچیس سال سے پرانی دھن میں موزوں کیا ہوا نغمہ سن سن کر اسی کے عادی ہو گئے ہیں، اس لئے نئی دھن کو قبول نہیں کر رہے۔

پچاس سال تک اردو نغمہ نگاری کرنے کے بعد پچھلے برس قتیل شفائی نے پنجابی زبان میں بھی گیت لکھنے شروع کئے ہیں اور اسی سال انہیں 92ء کے بہترین نغمہ نگار کا گریجوایٹ ایوارڈ دیا گیا ہے، قتیل شفائی ٹھیک کہتے ہیں.....

.... اور مجھے کیا چاہیے۔؟

پربت پربت گھوم چکا ہوں صحرا صحرا چھان رہا ہوں
ہر منزل کے حق میں لیکن کافر کا ایمان رہا ہوں

تیرے در پر عمر کٹی ہے پھر بھی کیا انجان رہا ہوں
دنیا بھر کے سجدوں میں اپنے سجدے پہچان رہا ہوں

دور سنہرے گنبد چمکے، لیکن گردن کون جھکائے
میں تو جنت بھی کھو کر آزاد منش انسان رہا ہوں

دیکھ مری انمول شرافت، لٹ کر بھی شرمندہ ہوں میں
جیت بھی لی اخلاص کی بازی، ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

کون ہے آج قتیلؔ جہاں میں مجھ سا کوئی ہمت والا
تیروں کی بوچھاڑ ہے لیکن پھر بھی سینہ تان رہا ہوں

احترام لب و رخسار تک آ پہنچے ہیں
بوالہوس بھی مرے معیار تک آ پہنچے ہیں

کیا وہ نظروں کو جھروکے میں معلق کر دیں
جو ترے سایہ دیوار تک آ پہنچے ہیں

اپنی تقدیر کو روتے رہیں ساحل والے
جن کو آنا تھا وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

اب تو کھل جائے گا شاید تری الفت کا بھرم
اہل دل جرات اظہار تک آ پہنچے ہیں

ایک تم ہو کہ خدا بن کے چھپے بیٹھے ہو
ایک ہم ہیں کہ لب دار تک آ پہنچے ہیں

اب کوئی شجر ہے نہ کہیں چھاؤں گھنی ہے
وہ دھوپ ہے سر پر کہ زمانے پہ بنی ہے

بہتر ہے رہے ساتھ تری زلف کا سایا
کہتے ہیں بری چیز غریب الوطنی ہے

جب کوئی کرن روزن زنداں سے در آئے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ نیزے کی انی ہے

پھولوں سے لپٹتی ہے مگر کتنی حیا سے
یہ چاندنی شاید ترے آنچل سے چھنی ہے

مل مل کے گلے تم تو پیو مے کدے والو
ان شیخ و برہمن میں تو مدت سے ٹھنی ہے

وابستہ نہیں تجھ سے فقط عشرت ماضی
تو اب بھی قتیل اب بھی مقدر کا دھنی ہے

اک بار جو تک لے اسے تکتا ہی چلا جائے
شعلہ سا بدن اس کا دہکتا ہی چلا جائے

کردار ادا جب میں کروں باد صبا کا
وہ پھول کی مانند مہکتا ہی چلا جائے

حالات کی بجلی نے کیا راکھ نشیمن
پر آس کا پنچھی کہ چہکتا ہی چلا جائے

آ جائیں میسر جسے آنکھوں کے وہ ساغر
وہ رند تو پی پی کے بہکتا ہی چلا جائے

پھولوں کی توقع ہے نہ امکان ثمر کا
اک پیڑ مگر پھر بھی مہکتا ہی چلا جائے

ہم لاکھ مہذب ہوں مگر تم ہی بتاؤ
جب ضبط کا پیمانہ چھلکتا ہی چلا جائے

ہر گام پہ الزام قتیل اب بھی ہیں لیکن
ان پاؤں میں بچھوا جو ہی چلا جائے

کہوں کیا فسانۂ غم اسے کون مانتا ہے
جو گذر رہی ہے مجھ پر مرا دل ہی جانتا ہے

تو صبا کا ہے وہ جھونکا جو گذر گیا چمن سے
نہ وہ رونقیں ہیں باقی نہ کہیں سماںتا ہے

اسے میں نصیب جانوں کہ بشر کی خود فریبی
کوئی بھر رہا ہے دامن کوئی خاک چھانتا ہے

ترا یوں خیال آیا مجھے غم کی دوپہر میں
کوئی جیسے اپنا آنچل مرے سر پہ تانتا ہے

میں نظام زر کی دیوی سے قتیلؔ آشنا ہوں
کہیں نام اس کا بانو، کہیں چندر کانتا ہے

ڈرتے نہیں زخموں سے ' ہم دارورسن والے
پتھر نہ اٹھا ہم پر شیشے کے بدن والے

سونے کی لحد میں بھی' شاید نہ سکوں پائیں
لاشے ہیں یہاں جتنے ریشم کے کفن والے

جو یاد دلاتے تھے ' اک بھولنے والے کی
جھونکے وہ کہاں یارو' پورب کی پون والے

راتیں مری ڈوبی ہیں ' تاریک اجالوں میں
اب چاند چمکنے کو آتے ہیں گہن والے

تو آئے تو لگتا ہے ' اپنی بھی سحر ہوگی
انداز ہیں سب تیرے سورج کی کرن والے

منظور پرستش ہے اک سانولی صورت کی
غزلوں میں سجاتا ہوں 'الفاظ بھجن والے

ہم کچھ بھی نہ بولیں گے جو چاہو ہمیں کہہ لو
ہم لوگ ہیں پردیسی اور تم ہو وطن والے

برباد ہوئی فن میں اک عمر قتیل اپنی
ملتے ہیں کہاں ہم سے فن کار لگن والے

ساون کے سہانے موسم میں اک ناریلی بادل جیسی
بے پنکھ اڑانیں لیتی ہے جو اپنے ہی آنچل جیسی

وہ جس کی کمر تک چوٹی ہے رنگت میں لال بروٹی ہے
چھو کر جو اسے دیکھا میں نے وہ مجھ کو لگی مخمل جیسی

لایا ہے بناکر اس کو دلہن' یہ جوبن 'یہ البیلا پن
اس عمر میں سر سے پاؤں تک لگتی ہے وہ تاج محل جیسی

چہرے پہ سجے آئینے ہیں یا دو بے داغ نگینے ہیں
کس جھیل سے آئی ہیں ڈھل کر یہ آنکھیں نیل کنول جیسی

جو دیکھے اسے وہ کھو جائے'کھو جائے تو شاعر ہو جائے
اس کا انداز ہے گیتوں سا' اس کی آواز غزل جیسی

وہ ایسے قتیل اب یاد آئے 'سپنا جیسے کوئی دہرائے
میں آج بھی اس کو چاہتا ہوں پر بات کہاں وہ کل جیسی

وفا کے شیش محل میں سجا لیا میں نے
وہ ایک دل ، جسے پتھر بنا لیا میں نے

یہ سوچ کر کہ نہ ہو تاک میں خوشی کوئی
غموں کی اوٹ میں خود کو چھپا لیا میں نے

کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا محاذ
اگر چراغ بجھا ' دل جلا لیا میں نے

کسی کی آس تو مجھ کو رہی ' سو میں تڑپا
شب فراق بتا تیرا کیا لیا میں نے

کمال یہ ہے کہ دشمن پہ جو چلانا تھا
وہ تیر اپنے کلیجے پہ کھا لیا میں نے

قتیل جس کی عداوت میں ایک پیار بھی تھا
اس آدمی کو گلے سے لگا لیا میں نے

یوں چپ رہنا ٹھیک نہیں کوئی میٹھی بات کرو
مور، چکور، پپیہا، کوئل سب کو مات کرو

ساون تو من بگیا سے بن برسے بیت گیا
رس میں ڈوبے نغموں کی اب تم برسات کرو

ہجر کی اک لمبی منزل کو جانے والا ہوں
اپنی یادوں کے کچھ سائے میرے ساتھ کرو

میں کرنوں کی کلیاں چن کر سیج بنالوں گا
تم مکھڑے کا چاند جلاؤ، روشن رات کرو

پیار بری شے نہیں ہے لیکن پھر بھی یار قتیل
گلی گلی تقسیم نہ تم اپنے جذبات کرو

جو بھی غنچہ ترے ہونٹوں پہ کھلا کرتا ہے
وہ مرے تنگئی داماں کا گلہ کرتا ہے

دیر سے آج میرا سر ہے ترے زانو پر
یہ وہ رتبہ ہے جو شاہوں کو ملا کرتا ہے

میں تو بیٹھا ہوں دبائے ہوئے طوفانوں کو
تو مرے دل کے دھڑکنے کا گلہ کرتا ہے

رات یوں چاند کو دیکھا ہے ندی میں رقصاں
جیسے جھومر ترے ماتھے پہ ہلا کرتا ہے

جب مری سیج پہ ہوتا ہے بہاروں کا نزول
صرف اک پھول کواڑوں میں کھلا کرتا ہے

کون کافر تجھے الزام تغافل دے گا
جو بھی کرتا ہے محبت سے گلہ کرتا ہے

لوگ کہتے ہیں جسے نیل کنول وہ تو قتیل
شب کو ان جھیل سی آنکھوں میں کھلا کرتا ہے

کیسے کیسے بھید چھپے ہیں پیار بھرے اقرار کے پیچھے
کوئی پتھر تان رہا ہے شیشے کی دیوار کے پیچھے

دل میں آگ لگا جاتا ہے یہ بن یار ' بہار کا موسم
ایک تپش بھی ہوتی ہے اس ٹھنڈی ٹھار پھوار کے پیچھے

سوچ ابھی سے پھر کیا ہوگا بیت گئی جب رات ملن کی
ایک اداسی رہ جائے گی پایل کی جھنکار کے پیچھے

کون لگائے کھوج کسی کا خود غرضی کے اس جنگل میں
ملتا ہے انسان یہاں بھی ' لیکن ایک ہزار کے پیچھے

ننگی ہو کر ناچ رہی ہے بھوکی روحوں کی مجبوری
جھانک سکو تو جھانک کے دیکھو جسموں کے انبار کے پیچھے

یہ حاکم بھی دوست ہے میرا' وہ ناصح بھی میرا ہمدم
کتنے ہی غمخوار پڑے ہیں ایک تیرے بیمار کے پیچھے

تیرا تو اک دل ٹوٹا ہے یار قتیل اداس نہ ہو تو
لوگ تو جان بھی دے دیتے ہیں پیارے ' اپنے یار کے پیچھے

ٹوٹنے اور بکھرنے کا چلن مانگ لیا
ہم نے حالات سے شیشے کا بدن مانگ لیا

جب سنا آئیں گے کچھ لوگ نصیحت کرنے
ایک دوجے سے وہیں ہم نے وچن مانگ لیا

وہ مسلمان تھی اللہ سے شرماتی رہی
اور بھگوان سے گوری نے سجن مانگ لیا

ہم بھی موجود تھے تقدیر کے دروازے پر
لوگ دولت پہ گرے' ہم نے وطن مانگ لیا

جس کی تحریر میں ہونا تھا ہمیں دفن قتیل
اس نے واپس وہی کاغذ کا کفن مانگ لیا

غم ہجر سے نہ دل کو کبھی ہمکنار کرنا
میں پھر آؤں گا پلٹ کر مرا انتظار کرنا

مجھے ڈر ہے میرے آنسو تری آنکھ سے نہ جھلکیں
ذرا سوچ کر سمجھ کر مجھے سوگوار کرنا

اسے ڈھونڈ سب سے پہلے جو ملا نہیں ہے تجھ کو
یہ ستارے آسماں کے کبھی پھر شمار کرنا

مرے شہر کی فضا میں کوئی زہر بھر گیا ہے
ترے حسن پر ہے لازم اسے خوشگوار کرنا

میں اٹھاؤں گا نہ احساں ترے بعد ناخدا کا
مجھے تو نے ہی ڈبویا مجھے تو ہی پار کرنا

یہی رہ گیا مداوا مری بدگمانیوں کا
ترا مسکرا کے ملنا مرا اعتبار کرنا

مرے بدنصیب واعظ تری زندگی ہی کیا ہے
نہ کسی سے دل لگانا نہ کسی سے پیار کرنا

کبھی اقتدار بخشے جو خدا قتیلؔ تجھ کو
جو روش ہے قاتلوں کی وہ نہ اختیار کرنا

دینے والے میرے دیس کی دھرتی کو خوش حالی دے
باغوں کو پھل پھول عطا کر کھیتوں کو ہریالی دے

مولا مجھ کو ڈال دے اپنے درویشوں کے رستے پر
اس کا بھی میں برا نہ مانوں جو نت مجھ کو گالی دے

جو اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھے پودوں پیڑوں کو
آنے والے موسم میں اس باغ کو ایسا مالی دے

صدیوں جھلسایا ہے جس کو پیلی گرم دوپہروں نے
اس دہقان کے چہرے کو اب شنگرف جیسی لالی دے

ساری دنیا تیرے ذمے دنیا کی ہر چیز تری
مجھ کو تو اک مرے کردار کی رکھوالی دے

بڑا نہ آخر بن بیٹھے وہ ہم سے چھوٹے لوگوں میں
جس کو رتبہ دیا ہے تو نے ظرف بھی اس کو عالی دے

یوں تو لکھتا ہی رہتا ہے نظمیں، غزلیں، گیت قتیلؔ
اسے کوئی تخلیق ہمیشہ زندہ رہنے والی دے

میں اس کا دوست ہوں وہ اعتراف کرتا تھا
مگر وہ باتیں بھی میرے خلاف کرتا تھا

سنا ہے گر کے مرا بادلوں کی سیڑھی سے
وہ آسمان کی چھت میں شگاف کرتا تھا

بنا ہوا ہے وہ چھوٹا سا ایک درباری
مزاج شاہ سے جو اختلاف کرتا تھا

کمال ہے کہ وہ بھی نذر بے خبری
جو ہم پہ روز نئے انکشاف کرتا تھا

جناب شیخ سے پہلے خدا بھی تھا منصف
مگر وہ سب کی خطائیں معاف کرتا تھا

وہ قتل ہو گیا بدصورتوں کی محفل میں
جو سارے شہر کے آئینے صاف کرتا تھا

قتیل اب تو مزاروں کا بھی ہے وہ قائل
خدا سے بھی جو کبھی انحراف کرتا تھا

جب تصور مرا چپکے سے تجھے چھو آئے
اپنی ہر سانس سے مجھ کو تری خوشبو آئے

مشغلہ اب ہے مرا چاند کو تکتے رہنا
رات بھر چین نہ مجھ کو کسی پہلو آئے

جب کبھی گردش دوراں نے ستایا مجھ کو
مری جانب ترے پھیلے ہوئے بازو آئے

جب بھی سوچا کہ شب ہجر نہ ہوگی روشن
مجھ کو سمجھانے تری یاد کے جگنو آئے

کتنا حساس مری آس کا سناٹا ہے
کہ خموشی بھی جہاں باندھ کے گھنگرو آئے

مجھ سے ملنے کو سرشام کوئی سایا سا
تیرے آنگن سے چلے اور لب جو آئے

اس کے لہجے کا اثر تو ہے بڑی بات قتیلؔ
وہ تو آنکھوں سے بھی کرتا ہوا جادو آئے

ذہنوں میں اس کا پورا سراپا بھی آئے گا
آتا ہے جو بکھر کے وہ یکجا بھی آئے گا

سورج کے ہمسفر جو بنے ہو تو سوچ لو
اس راستے میں پیاس کا دریا بھی آئے گا

کمرہ ہی بند ہے تو ہواؤں کا کیا قصور؟
کھڑکی کوئی کھلے گی تو جھونکا بھی آئے گا

ایسا نہیں کہ خشک ملے ہر جگہ زمیں
پیاسے جو چل پڑے ہیں تو دریا بھی آئے گا

اس شہر بے صدا کی خطا ہوگی جب معاف
مردے بھی جی اٹھیں گے ، مسیحا بھی آئے گا

یہ ہجرتوں کی شب ہے گھروں سے نکل پڑو
اس کا کرم ہوا تو مدینہ بھی آئے گا

جو دل جلا رہے ہیں مرا خود ہی سوچ لیں
اس روشنی کی زد میں اندھیرا بھی آئے گا

سورج کوئی قتیلؔ افق سے ہو گر طلوع
یہ رات بھی کٹے گی ، سویرا بھی آئے گا

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

سمجھو وہاں پھلدار شجر کوئی نہیں ہے
وہ صحن کہ جس میں کوئی پتھر نہیں گرتا

اتنا تو ہوا فائدہ بارش کی کمی سے
اس شہر میں اب کوئی پھسل کر نہیں گرتا

انعام کے لالچ میں لکھے مدح کسی کی
اتنا تو کبھی کوئی سخنور نہیں گرتا

حیراں ہے کئی روز سے ٹھہرا ہوا پانی
تالاب میں اب کیوں کوئی کنکر نہیں گرتا

کرنا ہے جو سر معرکہ زیست تو سن لے
بے بازوئے حیدر در خیبر نہیں گرتا

قائم ہے قتیل اب یہ میرے سر کے ستوں پر
بھونچال بھی آئے تو مرا گھر نہیں گرتا

روبرو وہ ہے عبادت کر رہا ہوں
اس کے چہرے کی تلاوت کر رہا ہوں

لو خریدو اک نظر کے مول مجھ کو
اپنی قیمت میں رعایت کر رہا ہوں

لی ہے صبر و ضبط نے مجھ سے اجازت
اپنے مہمانوں کو رخصت کر رہا ہوں

چھن گیا ملک جوانی بھی تو کیا غم
اب بھی یادوں پر حکومت کر رہا ہوں

کوئی بھی غم اس کو لوٹایا نہیں ہے
یوں امانت میں خیانت کر رہا ہوں

اس نے تو بس اک ذرا سی بات چھیڑی
میں وضاحت پر وضاحت کر رہا ہوں

عشق کر کے آپ بھی بن جائیں انساں
شیخ صاحب کو نصیحت کر رہا ہوں

عاشقی طوفان گریہ چاہتی ہے
اور میں آہوں پر قناعت کر رہا ہوں

آسماں جو شخص ہے سب کی نظر میں
اس کو چھو لینے کی جرات کر رہا ہوں

میں نے دیکھا ہے قتیل اس کا سراپا
میں کہاں ذکر قیامت کر رہا ہوں

کیا حسین آنچ ہے مگر قریب جائے کون
اس بدن کو چھو کے اپنی انگلیاں جلائے کون

کس کے عشق میں ہے دم کہ تاج اک نیا بنائے
اب دوبارہ پتھروں کو چاندنی پلائے کون

کس کے ہاتھ آ سکی ہیں بادلوں کی ٹولیاں
مٹھیوں میں بند کر سکا ہے ان کے سائے کون

شہر میں عجیب سی خبر اڑی ہے قتل کی
اس گلی میں اپنی لاش دیکھنے کو جائے کون

جب نہ ہوگا ایک بھی مسافر اس زمین پر
تب چلائے گا بھلا کارواں سرائے کون

سارے موسموں کی ہے قتیل جب خبر ہمیں
بجلیوں کے واسطے پھر آشیاں بنائے کون

یارو کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بددعا کہ اسے بھول جاؤں میں

دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں

سنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں

اک شب بھی وصل کی نہ مرا ساتھ دے سکی
عہد فراق آکہ تجھے آزماؤں میں

بدنام میرے قتل سے تنہا تو ہی نہ ہو
لا اپنی مہر بھی سر محضر لگاؤں میں

اترا ہے بام سے کوئی الہام کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں

اس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اسے قتیل گلے سے لگاؤں میں

محبت ہو رہی ہے تازہ دم آہستہ آہستہ
بڑھائیں آپ بھی آگے قدم آہستہ آہستہ

تھکے پاؤں بھی ہم تیرے شبستاں کے مسافر ہیں
پہنچ ہی جائیں گے منزل پہ ہم آہستہ آہستہ

ترا ملنا تو کیا ' پیغام ہی نے کر دیا ثابت
خوشی آئے تو مٹ جاتے ہیں غم آہستہ آہستہ

خود ان کو ہم نے اپنے کعبۂ دل میں بسایا تھا
اب اس کعبے سے نکلیں گے صنم آہستہ آہستہ

ابھی تو وہ ہمارے شہر دل کے خاص مہماں ہیں
کھلے گا حسن والوں کا بھرم آہستہ آہستہ

بہت کم آس رکھنی چاہیے سیرابی دل کی
برستا ہے یہاں ابر کرم آہستہ آہستہ

قتیل انجام ہوتا کاش اپنا عاشقوں جیسا
کہ دم دیتے کسی زانو پہ ہم آہستہ آہستہ

جام توڑوں بھی تو آنکھوں سے پلانا چاہے
پھر وہ ظالم مجھے مے خوار بنانا چاہے

اس کا وہ پیار کہ برسات کی پہلی بارش
جس میں انسان لگاتار نہانا چاہے

جب بھی آئے وہ لگے مجھ کو وہ اکتایا ہوا
لیکن ایسے کہ پلٹ کر بھی نہ جانا چاہے

جرم کیا تھا مرا اظہار تمنا کے سوا
وہ مجھے ضبط کی سولی پہ چڑھانا چاہے

دل کو یوں تھپکیاں دیتا ہوں کہ جیسے کوئی ماں
اپنے روتے ہوئے بچے کو سلانا چاہے

میں ہوں فرسودہ رواجوں سے بہت دور قتیلؔ
میں بھی کیوں چاہوں وہی جو یہ زمانہ چاہے

چاندنی سموئی ہے نقرئی جبینوں میں
رات کیوں نہ ہم کاٹیں جاگ کر حسینوں میں

اف وہ نیند کے سائے نیم باز آنکھوں میں
بھر رہا ہو مے کوئی جیسے آبگینوں میں

بدلیاں ہوں ساون کی یا سماں ہو پھاگن کا
حسرتیں سلگتی ہیں بھیگتے مہینوں میں

مدتیں ہوئیں تجھ کو دل دئے ہوئے لیکن
اپنا ذکر چھڑتا ہے اب بھی نازنینوں میں

جانے تیری سکھیوں نے تجھ سے کیا کہا ہوگا
ہم تو ہو گئے رسوا اپنے ہم نشینوں میں

سب دنیا نے کہا تجھے مت اعتبار کر اس کا
بیٹھا ساری عمر میاں اب انتظار کر اس کا

اسی لیے تو بستی والے تجھ پہ نام دھرتے ہیں
کس نے کہا تھا ذکر یہاں تو بار بار کر اس کا

وہ ہے بڑا البیلا اس کی بات بات ہے چنچل
اس کا دل رکھنے کو لہجہ اختیار کر اس کا

اور بہت سے کام ہیں پیارے تیرے درد مندوں کو
جو افسانہ چاہے سنانا ، اختصار کر اس کا

یا اب اپنے پاگل پن سے ہاتھ کھینچ لے بھائی
یا اس بار بہار میں دامن تار تار کر اس کا

آج فلاطوں ہوتا تو کچھ بے دماغ دانشور
اپنے کاندھوں پر رکھ لیتے سر اتار کر اس کا

پڑے ہیں آج قتیل کے پیچھے رنگ رنگ کے ناصح
مولا اس مشکل میں بیڑا تو ہی پار کر اس کا

کبھی نہ ختم ہوئیں گو شکایتیں اپنی
اسی عروج پہ اب بھی ہیں چاہتیں اپنی

وہ دن گئے کہ تنک تر مزاج رکھتے تھے
تمھی نہیں تو کہاں کی عداوتیں اپنی

مٹے جو تم پہ انہیں لازوال کر ڈالا
دکھائیں عشق نے کیا کیا کرامتیں اپنی

ہمیں تو فکر ہے اک دل کی اور محبت میں
شہنشہوں نے لٹا دیں حکومتیں اپنی

بہت بری تو نہ تھی شہر دل کی آب و ہوا
خراب کر گئیں صحت کو عادتیں اپنی

وہ اختلاف بڑھا قربتوں کے موسم میں
پڑوسیوں نے بدل لیں سکونتیں اپنی

یہاں سے دور نہیں حافظے کا گورستان
چلو تلاش کریں ہم بھی تربتیں اپنی

تم اپنے حصے کی پیتے تو جام کیوں چھنتا
قتیلؔ سامنے آتی ہیں نیتیں اپنی

اس دور میں توفیق انا دی گئی مجھ کو
کس جرم کی آخر یہ سزا دی گئی مجھ کو

میں نے جو کیا فصل بہاراں کا تقاضا
اک پھول کی تصویر دکھا دی گئی مجھ کو

یہ کون مرے نام کو دہرا سا رہا ہے
شاید کسی گنبد میں صدا دی گئی مجھ کو

وہ ان کا ملانا مجھے اک صاحب زر سے
اوقات مری یاد دلا دی گئی مجھ کو

حیرت ہے کہ اس بار بزرگوں کی طرف سے
تکمیل محبت کی دعا دی گئی مجھ کو

کچھ نام لکھے ہی تھے ابھی میرے قلم نے
کاغذ کی طرح آگ لگا دی گئی مجھ کو

گم ہو گیا مستی میں تڑپنے کا مزا بھی
کیا چیز قتیل آج پلا دی گئی مجھ کو

اپنے ہونٹوں پر سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں

کوئی آنسو تیرے دامن پر گرا کر
بوند کو موتی بنانا چاہتا ہوں

بڑھ گئی اس حد تلک بے اعتمادی
تجھ کو تجھ سے بھی چھپانا چاہتا ہوں

تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

اس لیے کی ہے تڑپنے کی تمنا
رقص کرنے کا بہانا چاہتا ہوں

آخری ہچکی ترے زانو پہ آئے
موت بھی میں شاعرانہ چاہتا ہوں

چھا رہا ہے ساری بستی پر اندھیرا
روشنی کو گھر جلانا چاہتا ہوں

پھول سے پیکر تو نکلے بے مروت
پتھروں کو آزمانا چاہتا ہوں

رہ گئی تھی کچھ کمی رسوائیوں میں
پھر قتیل اس در پہ جانا چاہتا ہوں

گم تھی اپنے دھیان میں گوری' کان میں ایسی بھنک پڑی
کھڑے کھڑے اس کے پیروں میں چھن چھن پایل چھنک پڑی

بند لبوں کو گیت ملے ' سنگیت ملا سناٹوں کو
اس کی آنکھوں سے ٹکرا کر ساری بستی کھنک پڑی

ہر پل ایسا لگے کہ جیسے بھیگ چکا ہوں بارش میں
یارو کتنی مہنگی مجھ کو اس چنری کی دھنک پڑی

آگ لگا کرتی ہے من میں پچھلی رات کے جھونکوں سے
آج نہ جانے شام سے پہلے کیوں پروائی سنک پڑی

اس دنیا کی رونق اپنے حصے میں تب آئی قتیل
حوا کے ہاتھوں سے جب آدم کے منہ میں کنک پڑی

مجھ کو دیکھنے والے تو کس دھیان میں ہے
آخر کیا مشکل میری پہچان میں ہے

اپنے ہجر کے پس منظر میں جھانک مجھے
میری سب روداد اسی عنوان میں ہے

کب سننے دیتی ہے شور سمندر کا
پانی کی اک بوند جو میرے کان میں ہے

بن سوچے سمجھے توثیق نہیں کرتا
کفر وہ شامل جو میرے ایمان میں ہے

ٹانک دو اس میں اک مصنوعی تتلی بھی
کاغذ کا جو گلدستہ گلدان میں ہے

حجرے میں گر کوئی بات ہوئی تو کیا
تھوڑا سا شیطان تو ہر انسان میں ہے

شوق تو یہ ہے آج کے فاتح کہلائیں
جنگ ابھی تک ماضی کے میدان میں ہے

پچھلی تحریروں کو بھول کے اے شاعر
تیرا نیا قصیدہ کس کی شان میں ہے
جس کے لیے میں غزلیں کہتا رہا قتیل
اس کا سارا حسن مرے دیوان میں ہے

ڈھل گیا چاند گئی رات' چلو سو جائیں
ہو چکی ان سے ملاقات ' چلو سو جائیں

دور تک گونج نہیں ہے کسی شہنائی کی
لٹ گئی آس کی بارات' چلو سو جائیں

لوگ اقرار وفا کر کے بھلا دیتے ہیں
یہ نہیں کوئی نئی بات' چلو سو جائیں

شام ہوتی تو کسی جام سے جی بہلاتے
بند ہے اب تو خرابات' چلو سو جائیں

اتنے چھینٹوں سے بھی دھویا نہ گیا داغ الم
کیا کہے گی ہمیں برسات' چلو سو جائیں

جو ہے بیدار یہاں اس پہ ہے جینا بھاری
مار ڈالیں گے یہ حالات' چلو سو جائیں

ہم نے کیا کچھ نہ سرشام کہا تم سے قتیل
آخر شب نہ ملو ہاتھ' چلو سو جائیں

پروفیسر جمیل ملک

قتیل کی نظم کا مرکزی کردار

قتیل شفائی کی شاعری کا مرکزی کردار عورت ہے یوں تو ہمارے اکثر شاعروں کا محبوب ترین موضوع بھی یہی رہا ہے۔ اس لئے علامہ اقبال گلہ گزار رہے، کہ ان بے چاروں کے اعصاب پر تو عورت سوار ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ عورت انسان کی ازلی بھول ہے، یہ وہ جادو ہے جو حضرت انسان کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ پھر شرار افلاطون بھی تو اس کے شعلوہ سے پھوٹتا ہے، شبیر بھی تو اسی کی گود میں جنم لیتا ہے۔ اور ابن مریم کا اعجاز مسیحائی بھی تو دراصل اسی عورت کا معجزہ ہے۔ اگر یہ سب سچ ہے تو پھر اس اہم ترین موضوع کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جدید شاعروں کی صف میں قتیل کے ہاں یہ موضوع اس لئے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے اس کردار کو مرکز و محور بنا کر ذات، حیات اور کائنات کی سیاحت کی ہے، پھر انداز بیان کے لحاظ سے بھی وہ اس کردار کے توسط سے باآسانی پہچانا جا سکتا ہے اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ موضوع تو قتیل کا اپنا موضوع ہے اور یہ انداز تو قتیل کا منفرد انداز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قتیل اس موضوع کو اپنانے اور عورت کے کردار سے رسم وراہ بڑھانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے کہ عورت اور مرد کا وجود ایک دوسرے کے لئے لابدی ہے۔ یہ دونوں زندگی کی راہ میں ہم سفر ہے، ہم مشرب و ہمراز ہیں۔ یہ زندگی کے دو کردار،

قدرت کے دو شاہکار ہیں۔ انہی سے دنیا میں ہلچل ہے۔ انہی کے جلوؤں نے کائنات کو نگار خانہ بنا رکھا ہے یہ کردار دائم و قائم ہیں۔

قتیل ایک شاعر ہے قتیل ایک مرد بھی ہے اس نے عورت کو انہی دو حیثیتوں سے دیکھا ہے۔ قتیل کی حس شاعری اور قتیل کی حس مردانگی میں ایک مسلسل کشمکش اور تصادم کا عمل جاری رہتا ہے اور اس سے قتیل کے ہاں عورت کا ایک مخصوص کردار جنم لیتا ہے۔ وہ کردار جس کے جسم کے زاویوں میں ایک توازن اور ہم آہنگی ہے۔ اٹھان اور نغمگی ہے یہی قتیل کا پسندیدہ پیکر جمال ہے۔ یہی اس کا انتخاب ہے۔

مجھ سے تعریف نہیں ہو سکتی
تیری ترشی ہوتی رعنائی کی
جس میں شامل ہو توازن کا سرور
تو وہ تصویر ہے چغتائی کی

(انتخاب)

شاعری توازن اور ہم آہنگی کا نام ہے۔ اور شاعر کی نظر وہ دھاگا ہے جس میں وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کے موتی سمیٹ کر انہیں اپنے خون دل سے آب دیتا ہے اور اپنے اس آئیڈیل' اس پیکر حسن و خوبی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جس کے گلے کا ہار ہو کر وہ اپنی عمر بھر کی کاوشوں کی داد پا سکے۔ قتیل کو یہ پیکر حسن و خوبی نظر آتا ہے' تو وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھتا ہے وہ اس پیکر حسن کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر جب اس کی روح میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اپنی کامرانیوں اور لغزشوں کا احساس اسے چونکا دیتا ہے۔ یہیں سے قتیل کی شخصیت میں چھپے ہوئے شاعر اور مرد کے درمیان ایک کشمکش اور آویزش کا آغاز ہوتا ہے۔ شاعر کے نزدیک داخلی طور پر عورت اور اس کی فطرتوں کا یہی وہ عفریت ہے جو ان کی کامرانیوں میں ناکامیوں کا زہر گھول دیتا ہے۔ خارجی طور پر معاشرے کی تشکیل کرنے

والا مرد ہے جس کے ہاتھوں میں عورت ایک کھلونا ہے' جس نے آج تک اسے مساوی حقوق نہیں دیئے' یہ وہی مرد ہے جس کے ہاتھوں میں تہذیب و تمدن' اخلاق و آداب اور قانون و سیاست کی باگ ڈور ہے۔ وہ ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کو کبھی دیو داسی' کنیز اور باندی بنا کر بازار میں لا سجاتا جاتا ہے۔ نائٹ کلبوں' رقص گاہوں اور بالاخانہ کی زینت بناتا ہے۔ قتیل شاعر ہے حساس دل رکھتا ہے۔ عورت کے تقدس پر جان دینے والا ہے مگر اس کی شخصیت پر اس مرد کی چھاپ بھی ہے جو سالہا سال سے عورت کو پامال کرتا رہا ہے۔ مرد کے داخلی تلون اور معاشرے میں پھیلی ہوئی طوائف الملوکی کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعر کا تراشا ہوا پیکر جمال' جلد ہی عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ شاعر صرف شاعر ہی نہیں مرد بھی ہے' معاشرے کا مرد جس کے اپنے جسم و روح میں توازن موجود نہیں اور جس نے سالہا سال کے استحصال سے عورت کے جسم اور روح کے توازن کو بھی پامال کر دیا ہے' بحیثیت مرد' یہ الزام قتیل پر بھی آتا ہے۔ مگر بحیثیت شاعر اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس کچلی ہوئی عورت کو زبان دیدی ہے۔ وہ مرد ہوتے ہوئے بھی اس مظلوم کردار کی صدائے احتجاج کا سب سے بڑا محرک ہے۔ وہ ایسا نوحہ گر جس کی نوحہ گری میں بھی نغمہ گری کے انداز نہیں۔ جو اپنے محبوب کردار کے ظلم اور مظلومیت میں برابر کا شریک رہا ہے۔ جس نے اپنے ذاتی تجربات کو کائناتی رنگ دے کر اس برباد کردار کو بجائے خود ایک فن اور ایک نصاب کا درجہ دے دیا ہے۔ قتیل مرد کے ہرجائی پن کو تسلیم کرتا ہے۔

قتیل کی ابتدائی نظموں' ہرجائی' کھنڈر اور پیش گوئی' میں مرد کے اس پہلو کا اظہار ہوا ہے۔ ان نظموں کا کردار محض قتیل کی سوچ کے مظہر بھی ہوں تو وہ بھی ان سے مرد کی بے وفائی اور متلون مزاجی ظاہر ہے۔ جو ہر بار محبوبہ کو چھوڑ کر کہیں دور نکل جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی نظموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وادی سرین کی عورت سے لحاق وصال کے بعد اسے پردیس کی صعوبتیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ وہ گھریلو زندگی کی پر سکون فضا' سرین کی شادات وادی اور ماں کی آغوش سے محروم ہو جاتا ہے اور پیٹ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر تاجروں کے دیس جا نکلتا ہے۔

تیرے جیتے جی اگرچہ میں بنا قاتل ترا
میرے سینے میں دھڑکتا ہے ابھی تک دل ترا
دور کوسوں دور تجھ سے علم وفن کے بھیس میں
بک رہی ہے بھوک میری تاجروں کے دیس میں

مگر اسے اپنے فن پر اعتماد ہے اور وہ اس کا سہارا لے کر کہتا ہے۔

اب جو اپنے فن کو مستقبل پہ لہراؤں گا میں
ان گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

(تاجروں کے دیس میں)

تاجر کے دیس میں شاعر کی وادی سربن کی وہ الھڑ اور پر خلوص عورت کہیں نظر نہیں آتی جو اب بھی کھیت سے دور دیکھتے ہوئے دوراہے پر اس کا انتظار کر رہی ہے۔ واپس وہ جانا نہیں چاہتا کہ اس کی فطرت کا تلون اور اس کی انانیت اس کے راستے میں حائل ہے۔ زندگی میں آگے بڑھنے کی دھن اس کے سر میں سما چکی ہے۔ اس کی طبیعت کی جدت پسندی اور اس کی شاعرانہ نظر ہر لحظہ کسی نئی برق تجلی کی منتظر ہے، وہ اب ایک ایسی دنیا، ایک ایسے بازار میں پہنچ چکا ہے، جہاں ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی ہیں۔

جوانی، حسن غمزے، عہد و پیماں، قہقہے، نغمے
رسیلے ہونٹ شرمیلی نگاہیں، مرمریں بانہیں

ان آوازوں سے اس کے کان پک جاتے ہیں۔ جو جہد للبقا سے تھک کر چور ہو جاتا ہے، مگر ماں کی آغوش اسے کہیں نہیں ملتی، وادی سربن میں جو عورت چراغ خانہ تھی وہ اب کہاں ہے، یہاں تو عورت شمع انجمن بن چکی ہے۔ وہ اپنا روحانی اور جسمانی توازن کھو چکی ہے اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ چکے ہیں۔ وہ ایک کٹی ہوئی پتنگ ہے، جس کو لوٹنے کے لئے بھی ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ دراصل قتیل کا یہ کردار

بذات خود ایک المیہ ہے۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ عورت ہے۔ اس کا وجود سراپا دعوت ہے۔ اس کے بے پناہ خلوص سے انکار ممکن نہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے خلوص کی یہ فراواں دولت صرف اسی ایک شخص کی جھولی میں ڈال سکتی ہے، جس سے وہ پہلی بار محبت کرتی ہے اور جس پر وہ سبھی کچھ نچھاور کر دیتی ہے۔ مگر جب اس کا ہی دیوتا، اسے چھوڑ کر انجانی وادیوں میں کھو جاتا ہے، تو اس کی یہ پہلی خطا ہمیشہ کے لئے اس کی ہار بن جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے وہ مستقل شکست کی علامت بن کر ابھرتی ہے، پھر جو کوئی آتا ہے اس کے احساس شکست پر ایک اور تازیانہ لگاتا ہے اور اس کے منتقمانہ جذبات کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اور ہوا دیتا ہے۔ پھر یہی چپ چپ رہ کر اندر ہی اندر سلگنے والی عورت، بے حجابی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے۔ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی، وہ اپنے جسم کی تجارت پر اتر آتی ہے۔ اور اپنے حسن و جمال کے لئے نئے نئے تاجروں اور نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اور جب قمقموں کے سیاہ اجالوں میں یہ عورت اپنی زندگی کے البم کا ایک ایک ورق الٹتی ہے تو اس کے روئیں روئیں سے فریاد نکلتی ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں، ان آنسوؤں کے آئینوں میں وہ پھر کسی سانولے سلونے کسی آنا رہ رو کسی نو عمر پنچھی کو منعکس کرنے اور اسے اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کے خواب دیکھتی ہے، تاکہ کسی طور پر اپنی شکستوں کی تلافی کر سکے۔ مگر ایک دن آتا ہے کہ نو عمر پنچھی بھی پھر سے اڑ جاتا ہے۔ وہ پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر آنے والے مہمانوں کے سواگت کے لئے بھویں بناتی ہے۔ پلکوں کو صیقل کرتی ہے۔ لب و رخسار پر غازے کی تہہ جماتی ہے۔ آئینے کے مقابل اس کے ضمیر میں چھپی ہوئی دوسری عورت اس کی ہم راز، اسکی اولین لغزش پر اسے کچوکے لگاتی ہے۔ اس کی خوابیدہ غیرت کو جگاتی ہے۔ اسے یہ گناہ کی زندگی تج دینے کا مشورہ دیتی ہے، مگر کیا ایسا ممکن ہے، کیا مرد کو یہ گوارا ہے کہ عورت اپنی وہ بساط اٹھا دے جہاں آکر وہ دن بھر کی تھکن دور کرتا ہے اور سخاوت کے طور پر اس کے جسم کے بجتے ہوئے کٹورے میں سونے چاندی کے چند سکے بھی ڈال جاتا ہے۔ یہی وہ داخلی کشمکش اور

تصادم کی اندوہناک کیفیات ہیں' جہاں شاعر قتیل تو اس کٹی ہوئی پتنگ کا آخری دم تک ساتھ دیتا ہے۔ مگر قتیل کے اندر چھپا ہوا مرد اس عورت کا زہر خندا' اس کی اذیت وہی کو بھی ہنس کو گوارا کرلیتا ہے کہ اس کو تو یہ میٹھا پاپ بہر طور عزیز ہے۔

یہ آئینے کا اداس چہرہ' تجھے تسلی نہ دے سکے گا
اب آئینے توڑ دے کہ تیری نظر نہ یہ بار سہہ سکے گی
کئی مراحل' کئی فسانے ابھی تیرے انتظار میں ہیں
یوں ہی چلی چل وگرنہ ' تیری یہ سیج قائم نہ رہ سکے گی

(آئینے کے سامنے)

قتیل شفائی کی شاعری کا یہ مرکزی کردار ہر زمانے میں افراط و تفریط کا شکار رہا ہے۔ ہر زمانے میں شاعروں نے کسی نہ کسی پہلو سے اس کردار کی نقاب کشائی کی ہے۔ سنسکرت زبان کا ایک شاعر درگپت طوائف ہی کی زبان میں کہتا ہے:۔

"رنڈیوں کو تو اس کی بھی کوئی سوچ نہیں ہوتی کہ آتما اور شریر کے جس کھیل سے جی بہلانے نے کو جا تری آیا ہے' وہ اسے اچھی طرح جانتا بھی ہے یا نہیں۔ اور ذرا اس مورکھ سے جو بیسوا کی باہوں میں رہ کر مزے تو اٹھاتا ہے لیکن یہ سمجھتا ہے کہ خواہ مخواہ کا خرچ ہوا' یہ تو پوچھو کہ آخر تیرے گھر والی تو اس کے کھانے کپڑے پر بھی تو چند ٹکے خرچ کرنے پڑتے۔ اور پھر یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ مردانگی کا رعب صرف روپے پیسے ہی سے جمایا جا سکتا ہے۔ آخر عورت کی بھی آتما ہے اور اسے بھی اپنی شریر کی پیاس بجھانی ہوتی ہے۔"

سعادت حسن منٹو کا خیال ہے کہ

"عورت کو یہ تمام گر سکھانے والے مرد ہی تھے' ورنہ کچھ نہ کچھ تبدیلی تو ان میں ضرور پیدا ہوتی۔" حیاتیاتی طور پر مرد کے جنسی پہلو کے بارے میں منٹو ہی نے کیا خوب پتے کی بات کہی ہے۔

"مرد نے جنسی لحاظ سے کوئی انقلاب انگیز ترقی نہیں کی' معدے اور جنس کے معاملے میں جیسا وہ پہلے تھا' اب بھی ویسا ہی ہے۔"

اگرچہ حیاتیاتی اور جنسیاتی طور پر عورت اور مرد کے تقاضے آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے اور آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہر دور میں مرد اور عورت کی جنسی زندگی کی مختلف صورتیں رہی ہیں اور ہر زمانے کا مروجہ نظام اقداران نئی صورتوں کو بروئے کار لا کر ان پر قانون اور اخلاق کی مہرثبت کرتا رہا ہے۔ عورتوں کا کاروبار کل بھی ہوتا تھا اور آج بھی یہ جنس سرعام منہ سے بول کر بکتی ہے۔ یہ مسئلہ کل بھی سنگین تھا اور آج بھی ہے۔ اسے موجودہ دور کا کرم کہئے یا ستم کہ جمہوریت کے فروغ کے ساتھ ساتھ عورت کی بھی خوب نمائش کی جا رہی ہے۔ اور اس کی نمائش کے لئے رنگا رنگ تفریح گاہیں' انجمنیں' فلمی ادارے' مکتب و مدرسے تیزی سے وجود میں آ رہے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عورت مرد کے دوش بدوش آنے لگی ہے۔ پھر ذرائع آمدورفت کی ترقی اور سائنسی دور کے کمالات سے مختلف ممالک سرعت سے ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ تہذیبوں میں عمل اور رد عمل کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ گئے وقتوں میں یہ مسئلہ ہر ملک میں موجود تو تھا مگر حدود اور فاصلوں کی وجہ سے اتنا بڑا اور گھناؤنا نظر نہیں آتا تھا۔ موجودہ قربتوں کی وجہ سے عورت اور مرد کے تعلقات کا مسئلہ زیادہ سنگین اور پیچیدہ صورتیں اختیار کرتا چلا جا رہا ہے' خصوصاً" وہ ممالک جو اپنی تہذیب و تمدن کا صحت مند سرمایہ استحصال پسندوں کی دست برد' سے نہیں بچا سکتے زیادہ خسارے میں رہے ہیں یہاں بھی سب سے زیادہ ظلم عورت کے ساتھ ہی ہوا۔ سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام اس افراط و تفریط میں مشرقی عورت ایک تو اپنی نسائیت گنوا بیٹھی ہے' دوسرے اس کی شخصیت زندگی کے بے شمار شعبوں میں بٹ کر اپنا آپ مٹا چکی ہے'۔ کسی مثبت نظریۂ زندگی کی عدم موجودگی نے اور بھی ظلم ڈھایا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ معاشرے کے معمار بدستور عورت کو اپنی حرص و آز کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ قتیل ایک جاگتے ہوئے شعور کا شاعر ہے۔ اس کے ذہن کی

تربیت گرد و پیش کی اسی فضا میں ہوتی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ اس طوائف الملوکی میں اس کا محبوب کردار لخت لخت ہو گیا ہے۔ عورت ایک ہی ہے مگر مرد ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے کیسے کیسے ناموں سے پکارتا ہے۔ ایکٹریس طوائف' داشتہ' ایکسٹرا' کسبی' مغنیہ' رقاصہ' مغویہ' نائکہ' یہ قتیل کی شاعری کے مختلف کردار ہیں' جو قتیل کے مرکزی کرداروں کے مختلف روپ ہیں۔ قتیل نے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ زندگی سے کچھ اڑتے ہوئے لمحے گزارے ہیں۔ ان کرداروں کی ریزہ ریزہ شخصیت کو چن چن کر اپنے مرکزی کردار کی تشکیل کرنا چاہی ہے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے دل کی دھڑکن بن کر گوناگوں انداز سے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔

سونپ جاتا ہے مجھ کو تنہائی
جس پہ دل اعتبار کرتا ہے
بنتی جاتی ہے نعل صحرائی

(ایکٹریس)

میں زندگی کی ہر ایک سانس کو ٹٹول چکی
میں لاکھ بار محبت کے بھید کھول چکی
میں اپنے آپ کو تنہائیوں میں تول چکی
میں جلوتوں میں ستاروں کے بول بول چکی
مگر کوئی بھی نہ مانا

(شمع انجمن)

جسم کی لذت ننگی ہو ہو کر جی کھول کے بکتی ہے
بکنے والی چیز یہاں خود منہ سے بول کے بکتی ہے
نئی نئی سونے چاندی کی حوریں ڈھالی جاتی ہیں
راز داروں کے محلوں میں کچھ بھیڑیں پالی جاتی ہیں

(داشتہ)

مجھے یہ ڈر ہے یہ قہقہے آخر آنسوؤں میں بدل نہ جائیں
بدن کے یہ تجربے تری عمر سے بھی آگے نکل نہ جائیں

(ایکسٹرا)

یا مرے پاس بھی ہوتی کوئی تابندہ کرن
یا ہر اک سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا

یہ سانس یہ سوکھے ہوئے پتوں کا ترنم
یہ جسم، یہ ٹوٹا ہوا پیتل کا کٹورا

یہ رنگ یہ تیزاب میں ڈوبی ہوئی چاندی
یہ عمر یہ بھادوں کی ہواؤں کا ہلورا

(سرتاج)

قتیل نے اس کردار کو جلوتوں میں بھی رقص کناں اور نغمہ بلب دیکھا ہے اور خلوتوں میں بھی وہ اس کے انگ انگ میں درد بن کر سماتا رہا ہے۔ اس نے اس کردار پر اپنے خلوص کی تمام تر دولت بھی نثار کی ہے اور وہ اس کی نظروں سے بھی گرا ہے کہ وہ اپنا جواب ہو گیا ہے، حاسدان شہر کو چھوڑیئے کہ محبت کرنے والوں پر انگلیاں اٹھانا ان کا فرض منصبی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کا پڑوسی بھی حق ہمسائیگی یوں ادا کرتا ہے کہ اس کی سب سے عزیز متاع اس سے چھین کر لے جاتا ہے۔ یہ وہی پڑوسی ہے، جو قتیل کی طرح کا ایک مرد تو ہے مگر جس کے سینے میں شاعر کا دل نہیں دھڑکتا، جن کی زرتار نظروں کی شہ پا کر قتیل کی امنگوں کا وہ مرکز و محور اس کے گھر کی وہ چاندنی بھی رقیب کے شبستان میں جا کر بجھ جاتی ہے۔

مگر نہیں میرے دل کو گلہ نہیں تجھ سے
اصول یہ ہے کہ جس نے جسے پسند کیا

(پڑوسی)

قتیل کشادہ دل کیساتھ یہ چوٹ بھی سہہ جاتا ہے' مگر وہ عورت کے فطری تلون سے باخبر ہے۔ عورت کی خودنمائی اور امارت پسندی سے وہ خوب واقف ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ عورت جو کل اسکی شہرت پر مرمٹی تھی آج کسی رازدار کی سیج پر بھی بکھر سکتی ہے۔ کیونکہ ہوس کے یہ سب کھیل مرد ہی نے تو عورت کو سکھائے ہیں۔

رات گئے تک گھائل نغمے کرتے ہیں اعلان یہاں
یہ دنیا ہے سنگدلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں
زرداروں کو نغموں میں جب جسم دکھائی دیتا ہے
ایک مہکتی سیج پہ اکثر ٹوٹتی ہے ہر تان یہاں

(چکلے)

وہی بے باک اشارے' وہی بھڑکے ہوئے گیت
کل میرے ہاتھ لگے' آج کسی اور کے ہیں؟

(لڑھکتا پتھر)

اگرچہ قتیل محبت کی بازی ہارنے کے بعد بھی اپنی اپنی پسند' کا نقطہء نظر اپنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بلند تر آورش اپنانے سے پہلے وادیء عشق میں قتیل کی بڑی بڑی آزمائش ہوئی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اس نے طنز کے نشتروں سے اپنے محبوب ترین کردار کو ہی گھائل کر دیا ہے۔ کبھی اس پر یہ گزری ہے کہ جن تیروں سے وہ اپنی محبوبہ کو چھلنی کرنے چلا تھا' ان سے خودنگوں سار ہو گیا ہے۔ اس کڑے امتحان سے گزر کر قتیل اس مقام تک جا پہنچا ہے' جہاں عورت کا غم اس کا اپنا غم بن جاتا ہے۔ یہ درد مشترک مرد اور عورت کو ایک ایسی بنیاد مہیا کرتا ہے جس پر پورے معاشرے کی عمارت نو تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اور یہیں پہنچ کر قتیل اپنے غم کو حیات و کائنات کے اٹوٹ رشتوں سے

منسلک کر لیتا ہے۔ اب وہ مرد و عورت کی تباہی' بے وفائی اور ہرجائیت کا ذمہ دار مروجہ نظام اقدار کو قرار دیتا ہے اور اس حقیقت کا اعلان بلند بانگ انداز میں کرتا ہے۔

یہ محبت یہ وفائیں' یہ مروت' یہ خلوص
ان کو سرمائے نے بیکار بنا رکھا ہے
آ کہ ان فتنہء زر پوش کو عریاں کر دیں
جس نے آفاق کو بازار بنا رکھا ہے

(درد مشترک)

مگر اس فتنہ زر پوش کا زہر معاشرے کے رگ و ریشے میں اس طرح سرائت کر چکا ہے کہ قتیل اپنی آواز کی تیز دھار کے ساتھ بھی اس زہر کے اثرات کو نہیں کاٹ سکتا۔ کیوں کہ اس فتنہ زر پوش کو عریاں کرنے کے لئے تو مسلسل کاوشوں اور بے پناہ ریاضتوں کی ضرورت ہے' یہ ایک ایسا احساس ہے کہ جو قتیل کی آواز میں ٹھہراؤ اور متانت پیدا کر دیتا ہے۔

اور میں پیار کی تقدیس میں مرنے والا
درد بن کر تیرے احساس میں بس جاؤں گا
وقت آئے گا تو اخلاص کا بادل بن کر
تیری جھلسی ہوئی دنیا پہ برس جاؤں گا

اور اب شاعر کو یہ احساس اندر ہی اندر گھلانے لگتا ہے کہ وہ طلوع فردا تک جی بھی سکے گا یا نہیں اور اس کی محبوبہ کا حشر کیا ہو گا؟ کیا اسے حسرتوں کی قبر سے نکال کر حیات نو بخشی جا سکے گی۔ قتیل کے احساس کی یہی کشمکش' جرم و سزا کی یہی آویزش قتیل کے مرکزی کردار کی ٹریجڈی کو بلند سطح پر لے آتی ہے۔ جبر و اختیار کی آویزش کے ساتھ ساتھ اس کے غم میں گہرائی اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

آ کہ دونوں سر جھکائیں وقت کی آواز پر
تو میرے انجام پر رو، میں تیرے آغاز پر

قتیل اپنی محبوبہ کو اسی آغاز کی یاد دلایا رہا ہے جب اس نے دلہن، بیوی اور ماں بننے کے حسین خواب دیکھے تھے۔ مگر کوئی فتنہ زر پوش ایک سرشار جوان بن کر ظاہر ہوا اور آن کی آن میں اس نوخیز کلی کو اپنے پاؤں تلے مسل کر چلا گیا اور پھر وہ عورت، عورت نہ رہی، ایک جنس بن گئی مگر اب بھی راتوں کی اتھاہ خاموشی میں یہ عورت ـــ

بلاتی رہی ہے خیالوں کی ڈولی سے اکثر کہاروں کے سونے سے پہلے
سنا ہے کہ یہ جنس بازار بھی ایک عورت تھی نیلام ہونے سے پہلے

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ قتیل وادی سربن کی محبوبہ سے بچھڑ کر اور ماں کی آغوش سے جدا ہو کر اس خلا کو پر کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ایک ایسی شریک سفر کی تلاش رہتی ہے جو اس کے آدرش کے مطابق ہو۔ اور جو اس کے شاعرانہ معیار پر پوری اتر سکے جو اسے اتنی ہی محبت دے سکے جو لڑکپن میں اسے اپنے ماحول اور ماں باپ کی آغوش میں ملی تھی۔ مگر ہم نے دیکھا کہ عملی دنیا میں شاعر کو اپنا آدرش نہیں ملتا۔ اگر کبھی کسی جسم کے توازن کا سرور اسے میسر بھی آ جاتا ہے تو روح اس توازن سے عاری نظر آتی ہے۔ شاید وادیٔ سربن کی محبوبہ میں قتیل کو جسم و روح کے توازن کی سرمستی میسر آ جاتی۔ مگر یہاں شاعر کی طبعی افتاد اس کے راستے کا پتھر بن جاتی ہے اور زیادہ غور اور توقف کے بغیر وہ اس منزل کو پھلانگ کر تاجروں کے دیس میں بھٹکنے لگتا ہے۔

مگر یہاں دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ کیا قتیل کسی مرحلے پر بھی اپنے آدرش کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہوا ہے؟ جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہ تو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جب عورت دلہن، بیوی اور ماں نہیں بن سکتی تو فتنہ زرپوش اسے بازار میں لا کر سجا دیتا ہے۔ ماتا کا جذبہ قتیل کے نزدیک بنیادی جذبہ ہے جس کے سہارے

عورت بیوی بن کر زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اور اگر اس جذبے کو تسکین نہ ملے تو وہ اپنا سب کچھ لٹا کر گھر کو بازار بنا دیتی ہے۔ اس کا اظہار قتیل نے اپنی ایک منفرد نظم "بانجھ" میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

کتنے ہاتھوں نے ٹٹولا میری تنہائی کو
کوئی جگنوں، کوئی موتی، کوئی تارا نہ ملا
کتنے جھولوں نے جھلایا مرے ارمانوں کو
دل میں سوئی ہوئی ممتا کو سہارا نہ ملا
کل بھی خاموش تھی میں، آج بھی خاموش ہوں میں
میرے ماحول میں طوفان نہ آیا کوئی
کتنے ارمان لئے ایک تمنا کے لئے
گھر لٹانے پہ بھی مہمان نہ آیا کوئی
کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے

(بانجھ)

امراؤ جان ادا میں مرزا رسوا نے عورتوں کی تین قسمیں گنوائی ہیں۔ نیک بختیں، خرابیں، بازاریاں، قتیل شفائی کی شاعری کے مرکزی کردار میں عورت کی دوسری قسموں کا رنگ روپ موجود ہے جو سوسائٹی کی دھتکاری ہوئی یا ٹھکرائی ہوئی عورتیں ہیں۔ جو یا تو پیدا ہی بازار میں ہوئی ہیں یا امراؤ جان ادا کی طرح کسی حادثے نے انھیں گھر سے نکال کر خانم کے بالا خانے میں پہنچایا۔ ظاہر ہے معاشرہ ایسی عورتوں کو نیک بخت کہنے پر کیونکر تیار ہو گا۔

قتیل دو وجوہ کی بنا پر اس عورت سے زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔ جس کی چال ڈھال یا خدوخال کسی امراؤ جان ادا یا کسی اور سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک تو قتیل کو اس کردار کے جسم کی گائی ہوئی حرارت سے لگاؤ ہے، دوسرے وہ اس کی پہلو داری مرمنا

ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس کردار کے گھناؤنے پن سے بھی خوب واقف ہے اور اس کو جنم جنم کے لئے اپنا کر ایک پاکیزہ اور باوقار زندگی بسر کرنے کی بار بار نہ صرف دعوت دیتا ہے' بلکہ اس کا غم خوار بھی ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ جس والہانہ انداز سے قتیل نے اس کردار سے محبت کی ہے اور جس جس روپ میں اس نے اس کردار کو اجاگر کیا ہے اس سے قتیل کی اپنی شخصیت پر بھی اس کردار کی پہلو داری کی ایسی ایسی چوٹ پڑی ہے کہ اب یہ عورت اگر اچانک نیک بخت بھی بن جائے تو ممکن ہے کہ شاعرانہ اعتبار سے قتیل کے لئے اس کردار کی پہلو داری اور بو قلمونی کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بھی ختم ہو جائے۔ اگر قتیل ابتداء ہی سے وادی سربن کی نیک بخت' عورت کو اپنی شاعری کا مرکزو محور بنا لیتا تو اسے ان کڑی منزلوں سے گزرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ کیا یہ امکان تھا کہ اس عورت میں قتیل کا فن یخ بستگی اوریک رنگی کا شکار ہو جاتا۔ اور وہ اپنے اس مخصوص کردار کی بدولت اپنے لب و لہجہ میں ندرت اور انفرادیت پیدا نہ کر سکتا۔ قتیل زندگی کی ندرتوں اور بہار کا شاعر ہے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے وہ مرزا رسوا کی طرح اپنی فنی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لانے کی خاطر ایک زاویے یا جھروکے کا انتخاب کر لیتا ہے جہاں سے وہ اپنے مرکزی کردار کے ذریعے حیات و کائنات کی سیاحت کر سکتا ہے۔ زمانے کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے سیاق و سباق کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا کے ناول' امراؤ جان ادا' میں خانم کا بالا خانہ' وہ نگار خانہ ہے جسے لکھنوی تمدن کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نگار خانے کے ایک جھروکے میں ہمیں امراؤ جان ادا بھی نظر آتی ہے۔ جو اگرچہ اپنی ذات میں اس زمانے کا مکتب و مدرسہ ہے لیکن جو لکھنوی تمدن کے زوال کا باعث بھی بنتی ہے۔

قتیل نے اپنی شاعری میں بازار حیات کو خانم کے نگار خانے کے مماثل قرار دیا ہے۔ کہ اور چیزوں کی طرح عورت بھی اس بازار میں سالہا سال سے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی رہتی ہے رسوا کی طرح قتیل کا مرکزی کردار بھی بازار حیات کے کسی گوشے میں بج دھج کر بیٹھا آنے جانے والوں کو دعوت نظر دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ گوشہ کبھی ٹمپل روڈ پر واقع ہے اور کبھی میکلوڈ روڈ پر، یہ جھروکا کبھی ہیرا منڈی میں کھلا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی اس کے پٹ سرائے بیلی رام کی طرف جا کھلتے ہیں۔

مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا، قتیل شفائی کے ہاں ہزار ہا شبیہوں میں بٹ چکی ہے جو ہمیں بازار زندگی کے نگار خانوں کی طرف اشاروں میں بلاتی رہتی ہے اور سو سو زاویوں سے اپنی دکھ بھری داستان حیات سناتی رہتی ہے۔

یہ مجبوری تھرکتی ہے، جوانی بر سر محفل
بدن کے مسکراتے زاویے فریاد کرتے ہیں
جھروکوں سے مہکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے فاقے
یہاں بکتا ہے سودا زندگی کے امتحانوں کا
یہاں دن کو بدن تلتے ہیں میزان حکومت میں
یہاں جمتا ہے راتوں کو اکھاڑا رہنماؤں کا

قتیل کا مرکزی کردار وہ آئینہ ہے، جو ٹوٹ کر ان گنت کرچیوں میں تقسیم ہو چکا ہے قتیل کی نگاہ شیشہ گر ان کرچیوں کو سمیٹ کر ہر بار کوئی آئینہ تراش لیتی ہے۔ قتیل کے ہاں یہ آئینہ بار بار ٹوٹتا ہے اور وہ بار بار ان نوکدار ٹکڑوں کو اپنی نظر میں چھو لیتا ہے، اسے اس آئینہ کی شکستگی ہی سے تو عشق ہے۔ اس کی فنکارانہ نظر تو ہر شیشے میں اپنے محبوب کردار کو کسی نئے روپ میں جلوہ گر دیکھنا چاہتی ہے۔

زندگی آئینہ بردوش کھڑی ہے کب سے
مجھ کو تیری ہی کوئی شکل دکھانے کے لئے

لیکن کیا ان شیشوں کی مسیحائی قتیل کے بس کا روگ ہے۔ کیا قرنہا قرن سے

آج تک کوئی معاشرہ بھی اس کچلی ہوئی عورت کے درد کا درماں پیش کر سکا ہے۔ کیا موجودہ سائنسی دور کی تمام تر ترقی کے باوجود آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے' اس مسئلے کی سنگینی کو تسلیم کرنے کے بعد ذہن میں یہ کرید شروع ہو جاتی ہے کہ اس کا حل کیا ہے۔ کیا محض ایک معاشی اور معاشرتی مسئلہ ہے اور کیا طبقاتی تفریق ختم ہونے کے بعد ایک خوشحال معاشرے میں عورت بازار سے اٹھ کر گھر کی تمام تر ذمہ داریاں ہنسی خوشی قبول کرے گی؟ یا اس مسئلے کے کچھ اور بھی پہلو ہیں۔

فرائیڈ کا خیال ہے کہ حیاتیاتی طور پر مرد کے مقابلے میں عورت ایک انفعالی کردار ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مرد ہمیشہ عورت کی انفعالیت پر غالب آکر' اسے اپنی برتری کا احساس دلاتا رہا ہے نتیجہ" عورت اپنے احساس کمتری کو چھپانے کی کوشش میں غیر شعوری طور پر کئی جنسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہیں سے عورت کی نفسیات میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں____ اور یوں یہ مسئلہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی بن جاتا ہے اور اپنی اپنی پسند کے اصول کو بھی اپناتا ہے۔ مستقبل میں طبقاتی تفریق شاید ختم ہو جائے لیکن اپنی اپنی پسند کا اصول جتنا عمدہ ہے محبت کی دنیا میں اس کا اطلاق اتنا ہی مشکل ہے۔ اگر اس اصول کو اپنا لینا اتنا آسان ہوتا تو دوسرے شاعروں کی طرح محبت میں قتیل کی ناکامی عجب ایک سانحہ سا' بن کر رہ جاتی۔ اگر قتیل کسی سانولی کو چاہتے اور سانولی ' کسی اور سانوریا' کے فراق میں کوئل کی طرح کوکتی رہے' تو آپ ہی بتائیے کہ اس سارے کھیل میں کون کون گھائل ہوا کس کس کی جان گئی۔ طبقاتی بندوبست کو ختم کرنے کے عوامل تو انسان کے اختیار میں ہیں اور وہ ان سے کام بھی لے رہا ہے لیکن حیاتیاتی' نفسیاتی اور داخلی طور پر ہر مرد و عورت کا جنسی مسئلہ تو اس کا ذاتی مسئلہ بھی ہے جس کے اظہار کی کم و بیش صورتیں اتنی ہی ہیں جتنی کہ کرہء ارض میں انسانوں کی آبادی ہے' تو پھر کیا اس مسئلے کا حل ممکن نہیں۔ مرزا رسوا کے کردار امراؤ جان ادا نے عمر بھر کی آوارگی کے بعد آخری خط میں لکھا تھا۔

"میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہر گز ملال نہ ہو، بہت سی فتنے ٹل جائیں اور بہت سی دور ہو جائیں۔ قتیل کی نظر میں اس گتھی کو یوں سلجھایا جا سکتا ہے کہ حقائق سے پردہ ہٹا کر پورے اخلاقی نظام کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔

راتوں کو حبس ہو کہ گجر دم کی ہوا میں
گجروں کی یہ جھنکار جھروکے میں رہے گی
جب تک نہ حقائق سے ہٹا دے کوئی پردہ
عورت یوں ہی اخلاق کے دھوکے میں رہے گی

اگرچہ قتیل نے اپنے مخصوص انداز میں زیر بحث کردار کی داخلی اور نفسیاتی تحلیل کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن اس نے اس کردار کے المیے کے پس منظر میں زیادہ تر سرمایہ نظام کو ہی سزا وار ٹھہرایا ہے۔ یہ ایک کھلی صداقت ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کی تکرار سے بعض اوقات قتیل کے داخلی جذبوں کی شدت روبہ زوال بھی ہوئی ہے۔ ان مواقع پر قتیل کی آواز کا زیر و بم، اس کے بولتے رنگوں کی نقش گری اور فنکارانہ چابکدستی اس کے کام آتی ہے۔ اور وہ اپنے بنیادی کردار کی شخصیت کے سبھاؤ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کا پسندیدہ کردار بھی یہی ہے لیکن اس کے ہاں معاشی ناہمواری کی کھلی تکرار نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے اس کے ہاں جرم و سزا اور جبر و اختیار کی کشمکش اور تصادم کا عمل قتیل کے مقابلے میں شدید تر ہو جاتا ہے۔ دراصل اس میں منٹو کی شخصیت کی زہرناکی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

حقائق سے پردہ اٹھانے اور مروجہ نظام اخلاق میں انقلاب برپا کرنے کے دونوں ہی قائل ہیں، مگر قتیل ایک شاعر ہے، وہ حقائق کا پردہ چاک کرتے ہوئے پھر خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جس سے اس کے شاعرانہ لب و لہجہ میں زہر کے ساتھ امرت بھی گھل مل جاتا ہے۔ اور یہی وہ میٹھا زہر ہے جسے قتیل عمر بھر ہنس ہنس

کر پیتا رہا ہے۔ اگر قتیل کے لب و لہجہ میں زہر خند کے ساتھ گھلی ملی یہ مٹھاس نہ ہوتی تو وہ بھی منٹو کی طرح عدل و انصاف کے کٹہرے میں ایک آدھ بار تو ضرور ہی نظر آ جاتا۔

تاہم شخصیتوں اور آہنگ کے اس اختلاف کے باوجود جہاں تک موضوع کے انتخاب اور یگانگت کا تعلق ہے' موجودہ دور میں قتیل کو جدید شاعری کا سعادت حسن منٹو کہا جا سکتا ہے۔ مستقبل طوائفیت کا کوئی حل تلاش کر سکے گا یا نہیں اس کا مثبت یا منفی جواب تو خود مستقبل دے گا۔ پھر بھی منٹو اور قتیل ایسے فنکاروں کی پر خلوص کاوشوں اور نیم محکوم اور نو آزاد ممالک کی انقلاب آفریں صورت حال سے یہ امید ضرور بندھتی ہے کہ مستقبل میں اس مسئلے کی سنگینی اور گھناؤنا پن ختم ہو جائے گا۔

حیاتیاتی اور نفسیاتی طور پر اس مسئلے کی پیچیدگیاں شاید بہت دیر میں ختم ہوں یا کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ باقی رہیں' لیکن اس بات کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مستقبل میں عورت اور مرد کے مابین تمام رشتے افہام و تفہیم کی بنیادوں پر استوار ہوتے چلے جائیں گے۔

ہم نے قتیل کی شاعری کے مرکزی کردار کو گوناگوں صورتوں میں دیکھا ہے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک محرک پہلو دار اور زندہ کردار ہے جو اپنے سینے میں ماضی کی خونیں تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ جس سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج یہی کردار پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ "مجھے بچا لو" ورنہ خود تباہ ہو جاؤ گے۔ میں شکست کا اشارہ ہوں۔ میں زوال کی علامت ہوں" قتیل یہ فریاد سن کر خاموش تماشائی کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں گزر جاتا۔ اس کی نظر میں تو یہ کردار اپنی بیچارگی اور آوارگی کے باوجود قدرت کا شہ پارہ ہے۔ وہ خود بھی تو از خود رفتہ مسافر ہے۔ اس کی عظمت یہ ہے کہ وہ سر بازار اس کردار کو بڑھ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ آخر اسے بھی تو منزل پر پہنچنے کے لئے ایک درد مند شریک سفر کی ضرورت ہے۔

کام لیا ہے تو نے اک سوچی سمجھی نادانی سے

نام مٹایا تو نے اپنا جنت کی پیشانی سے
اونچی ہے انسان کی عظمت، گندم کی سلطانی سے

اے آدم کی پہلی بھول
تیرا • میرا ایک اصول

قتیل خود بھی دامودر گپت، فلابیر، مرزا رسوا، اور سعادت حسن منٹو کے قبیلے کا ایک با شعور، حساس اور منفرد کردار ہے، جسے عورت اور مرد کے ازلی اور ابدی رشتے سے عشق ہے۔ جو جنم جنم کے ساتھی ہیں اور اپنی گمراہیوں اور رسوائیوں کے باوصف عظیم ہیں۔

سب دنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا میت
سنتا ہوں دن رات میں جس کی سانسوں کا سنگیت
چھائے میرے ذہن میں اکثر بن بن کر الہام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

(سانولی سی اک عورت)

اقراء

پیمبر سے کہا جبریل نے :۔
" اقراء "
پیمبر نے کہا:۔
" میں پڑھ نہیں سکتا "
مگر اس لمحہ نور و تجلی کا نتیجہ تھا
کہ اک امی وہ عالم بن گیا
روئے زمیں پر جس سے بڑھ کر
کوئی بھی علم و بصیرت کا نہ مالک تھا ـــــــ
یہیں تک ختم ہو جاتا نہیں یہ سلسلہ علم وبصیرت کا
پیمبر کے غلاموں تک نے پائی روشنی
علم و بصیرت کی
اجالا ہو گیا مشرق سے مغرب تک ـــــــ
کہا میرے زمانے سے گذرتے وقت نے :۔
" اقراء "
کہا میرے زمانے نے :۔

"مجھے پڑھنا تو آتا ہے
مگر میں بھول جانا چاہتا ہوں سارے لفظوں کو
اور ان لفظوں میں پوشیدہ ہر اک علم و بصیرت کو
کتابیں غرق دریا کر کے اطمینان و راحت چاہتا ہوں میں
کہ اب ایسا ہی کرنا چاہئے مجھ کو ---"
گذرتے وقت نے پوچھا بھلا کیوں؟
کہا--- "علم و بصیرت اور کتب خانے بھلا مرے کس کام کے
جب ہر چوراہے پر
بلند آواز لاوڈ اسپیکروں سے وہ سبھی کچھ نشر ہوتا ہے
نفی ہوتی چلی جاتی ہے جس سے دم بہ دم علم و بصیرت کی'
--- پھر اس کے ساتھ' سچی بات تو یہ ہے
نہ میں کوئی پیمبر ہوں' نہ تو کوئی فرشتہ ہے
میں تیری بات کیوں مانوں ---"

دو عادتیں

مری دو عادتیں تھیں
ایک سگرٹ ___ ایک محبوبہ
کہا احباب نے مجھ سے
کہ محبوبہ کو چھوڑا جا بھی سکتا ہے
مگر سگرٹ نہیں چھٹتا

کہا میں نے
کہ اے میرے جہاں دیدہ رفیقو' دوستو
سن لو---
تمہارے تجربوں سے معذرت کرتے ہوئے.
سگرٹ کو چھوڑا آج سے میں نے
مگر وہ میری محبوبہ---؟
وہ اب دہرا سرور زندگی دینے کو
سگرٹ کی طرح میرے لبوں کی لاج رکھے گی
نہ ہونے دے گی سگرٹ کی کمی محسوس وہ مجھ کو
___ مری اب ایک ہی عادت ہے
محبوبہ---

رقابت

رقیب اک دوسرے کے ہم بنیں اے دوست کیوں آخر
رقابت صرف غیرت مند انسانوں میں ہوتی ہے
اسے پانا اسے کھونا تو ہے اک مشغلہ اپنا
محبت جس کو کہتے ہیں وہ افسانوں میں ہوتی ہے

اسے جب میں نے اپنایا تو یہ معلوم تھا مجھ کو
مرے پیچھے قطاروں میں کھڑے ہیں بوالہوس کتنے
وہ جب پھر تیرے ہاتھ آئی تو سوچا تو نے بھی ہو گا
پس پردہ ملیں گے تجھ کو تیرے ہم نفس کتنے
نہ شرم آئی کبھی تجھ کو ' نہ شرم آئی کبھی مجھ کو
بنائے آج تک ہم نے جوازوں کے قفس کتنے

لڑائی ہو نہیں سکتی کبھی دو ہوشمندوں میں
یہ غیرت کی بری عادت تو دیوانوں میں ہوتی ہے
رقیب اک دوسرے کے ہم بنیں اے دوست کیوں آخر
رقابت صرف غیرت مند انسانوں میں ہوتی ہے

مشورہ

اے میرے بزدل رقیب

جانتا ہوں میں بہت مدت سے تیرے فقر کو
اپنے اندر کیوں چھپا بیٹھا ہے چھوڑ اس مکر کو

تو اگر یوں ہی رہے گا بند اپنے خول میں
بھیک تک کوئی نہ ڈالے گا ترے کشکول میں

دیکھ اپنے واسطے یوں وجہِ رسوائی نہ بن
اور ساری ذلتیں سہہ لے مگر بھائی نہ بن
عشق کرنا ہے تو عاشق بن کے جا اس کے قریب
اے مرے بزدل رقیب

شاعری سچ بولتی ہے!

لاکھ پردوں میں رہوں بھید مرے کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
میں نے دیکھا ہے کہ جب میری زباں ڈولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

تیرا اصرار کہ چاہت مری بے تاب نہ ہو!
واقف اس غم سے میرا حلقہء احباب نہ ہو
تو مجھے ضبط کے صحراؤں میں کیوں رولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

یہ بھی کیا بات کہ چھپ چھپ کے تجھے پیار کروں
گر کوئی پوچھ ہی بیٹھے تو میں انکار کروں
جب کسی بات کو دنیا کی نظر تولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

میں نے اس فکر میں کاٹیں کئی راتیں کئی دن
میرے شعروں میں ترا نام نہ آئے، لیکن
جب تری سانس مری سانس میں رس گھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

تیرے جلووں کا ہے پر تو مری ایک ایک غزل
تو مرے جسم کا سایا ہے تو کترا کے نہ چل
پردہ داری تو خود اپنا ہی بھرم کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

سانولی سی ایک عورت

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

وہ عورت جس کے ہونٹوں پر ناچیں میرے گیت
جس کی بڑھتی شہرت کو میں سمجھوں اپنی جیت
سب دنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا میت
سنتا ہوں دن رات میں جس کے سانسوں کا سنگیت
چھائے میرے ذہن پہ اکثر بن بن کے الہام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
ابھرے ابھرے ہونٹ ہیں اسکے کھلتے سرخ گلاب
اس کی رنگت مستقبل کا دھندلا دھندلا خواب
اس کے نغموں کی لے پر بہتا ہے مست چناب
اس کی چال چکوروں جیسی، اس کا بدن کمخاب
پیاس بھڑکتی ہے جب میری بن جاتی ہے جام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
میں جب اس کا ذکر کروں تو چونک پڑیں سب لوگ
کوئی نصیحت کرے مجھے اور کوئی منائے سوگ
دیکھ سکا ہے کب کوئی دو روحوں کا سنجوگ
اس بے چاری کو سب جانیں میری جان کا روگ
میری خاطر سہتی ہے سب دنیا کے دشنام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

میں کہتا ہوں ان پگلوں سے چھوڑو پچھلی بات
اپنے پیار سے بدل دیئے میں نے اسکے دن رات
دولت والے اسے خریدیں' کیا انکی اوقات
برسے گی اب میرے ہی آنگن میں یہ برسات
میری ہی چاہت کا لے گی اپنے سر الزام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
چھوڑ کے عصمت کی منڈی اور جسموں کا بازار
پیش کرے اونچے محلوں میں وہ فن کے شہکار
مان لیا ہے سب نے اس کو اک اونچی فنکار
زیب نہیں دیتا اب اس کو یہ گندا بیوپار
اوروں کی مانند بھلا کب ہوتی ہے نیلام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
مان لیا کچھ اور تھی پہلے اس کے پیار کی ریت
ایک ہی سر پر کبھی نہ قائم تھا اس کا سنگیت
پھر بھی سب کچھ چھوڑ کے اس نے مجھے بنایا میت
جب تک وہ چاہے گی اندھے رہیں گے میرے گیت
اپنے ساتھ لئے پھرتی ہے وہ میرا انجام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

بانجھ

کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے!
میرے آنگن میں کوئی چاند جنم لے نہ سکا
ٹکٹکی باندھ کے افلاک پہ، روئی برسوں
آج تک کوئی بھی واپس مرا غم لے نہ سکا

وہ زمیں جو کوئی پودا نہ اگل سکتی ہو
قاعدہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جاتا ہے
گھر میں ہر روز یہی ذکر، یہی شور سنا
شاخ سوکھے تو اسے توڑ دیا جاتا ہے

"مجھے باہوں پہ اٹھا لے مجھے مایوس نہ کر
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجا لے مجھ کو
اپنے احساں کے صلے میں مرا جوبن لے لے"
(کر دیا سب نے مقدر کے حوالے مجھ کو)

ایک، دو، تین -- کہاں تک کوئی گنتا جائے
ان گنت سانس مہکتے ہیں مرے سینے پر
مرے لب پر کوئی نغمہ، کوئی فریاد نہیں
لوگ انگشت بدنداں ہیں مرے جینے پر

کتنے ہاتھوں نے ٹٹولا مری تنہائی کو
کوئی جگنو، کوئی موتی، کوئی تارا نہ ملا
کتنے جھولوں نے جھلایا مرے ارمانوں کو
جب حسن کے شاداب نظارے نہ رہیں گے

دل میں سوئی ہوئی ممتا کو سہارا نہ ملا
کل بھی خاموش تھی میں آج بھی خاموش ہوں میں
میرے ماحول میں طوفان نہ آیا کوئی
کتنے ارمان لئے ایک تمنا کے لئے
گھر لٹانے پہ بھی مہمان نہ آیا کوئی
کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے

پیش گوئی

سونے کی انگوٹھی میں یہ ہیرے کا نگینہ؟
تحفہ ترا لیتے ہوئے دل کانپ رہا ہے
آغاز میں انجام کی باتیں مرے محبوب
احساس کی رگ رگ میں لہو ہانپ رہا ہے

یہ خواب جو میں نے تری آنکھوں سے نچوڑا
افسوس کہ اس خواب کی تعبیر غلط ہے
میں نے تو نہ چاہا تھا یہ سونے کا دریچہ
شاید ترے فردوس کی تعمیر غلط ہے

افسوس تری مصلحت اندیش محبت
دل سے نہیں سونے سے مجھے تول رہی ہے
لیکن مرے محبوب اسے کون چھپائے
وہ راز جو ہیرے کی کنی کھول رہی ہے

ڈھل جائیں گے جس وقت شفق زار لبوں سے

جب چاند سے ماتھے پہ نہ پھوٹے گا اجالا
جب رات سی آنکھوں میں ستارے نہ رہیں گے

ہو جائے گا عریاں تری فطرت کا تلون
ہیرے سے اتر جائے گا سونے کا لبادہ
جس وقت میں رہ جاؤں گی آفاق میں تنہا
ہیرا مرے کام آئے گا سونے سے زیادہ

ڈرو اس وقت سے

ڈرو اس وقت سے
اے شاعرو، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو
اچانک جب تمہاری سمت
کچھ صدیوں پرانے شیش محلوں سے
سناسن تیر برسیں گے
بہت چلاؤ گے تم
اور پکارو گے بہت باذوق دنیا کو
مگر باذوق دنیا کا ہر اک باشندہ
پہلے ہی سے گھایل ہو چکا ہوگا
جو باقی لوگ ہوں گے
وہ تمہارا ساتھ کب دیں گے
کہ وہ تو رجعتوں کی ہیروئن پینے کے عادی ہو چکے ہوں گے
انہیں تو صرف وہ باتیں بھلی معلوم ہوں گی
جہالت کا اندھیرا اور بھی ان کی رگوں میں جن سے بھر جائے
وہ باتیں -----
عقل و استدلال کا اک شائبہ جن میں نہیں ہوتا

یہ مانا تم بہت سمجھاؤ گے ان کو
مگر کوئی نہ سمجھے گا
اور اس دورِ سیاہی میں
جو برپا کربلا ہو گی
وہاں کوئی بھی حر پیدا نہیں ہو گا تمہاری پاسداری کو
ملیں گے سب تمہارے خون کے پیاسے

ڈرو اس وقت سے
اے شاعرو' اے نغمہ خوانو' اے صنم سازو
جو ممکن ہو تو بڑھ کر روک لو
اس آنے والے وقت کا رستہ

شہر آشوب

رشتہ دیوار و در تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
مت گرا اس کو یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

تیرے میرے دم سے ہی قائم ہیں اس کی رونقیں
میرے بھائی یہ نگر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے اور میرا بھی ہے

شاخ شاخ اس کی ہمیشہ بازوئے شفقت بنی
سایا سایا یہ شجر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کھا گئی کل ناگہاں جن کو فسادوں کی صلیب
ان میں اک نور نظر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

اپنی حالت پر نہیں تنہا کوئی بھی سوگوار
دامن دل تر بہ تر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کچھ تو ہم اپنے ضمیروں سے بھی کر لیں مشورہ
گرچہ رہبر معتبر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

غم تو یہ ہے گر گئی دستار عزت بھی قتیل
ورنہ ان کاندھوں پہ سر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

لمحوں کی پرستار

میں نے چاہا تھا اسے روح کی راحت کے لیے
آج وہ جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
میری آنکھوں نے جسے پھول سے نازک سمجھا
اب وہ چلتی ہوئی تلوار بنی بیٹھی ہے
ہمسفر بن کے جسے ناز تھا ہمراہی پر
رہزنوں کی وہ طرف دار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

اس کی معصومیت دل پر بھروسہ تھا مجھے
عزم سیتا کی قسم ، عصمت مریم کی قسم
یاد ہیں اس کے وہ ہنستے ہوئے آنسو مجھ کو
خندہ گل کی قسم ، گریہ شبنم کی قسم
اس نے جو کچھ بھی کہا میں نے وہی مان لیا
حکم حوا کی قسم ، جذبہ آدم کی قسم
پاک تھی روح مری چشمہ زمزم کی قسم

میں نے چاہا تھا اسے دل میں چھپالوں ایسے
جسم میں جیسے لہو ، سیپ میں جیسے موتی
عمر بھر میں نہ جھپکتا کبھی اپنی آنکھیں
میرے زانو پہ وہ سر رکھ کے ہمیشہ سوتی
شمع یک شب تو سمجھتا ہے اسے ایک جہاں
کاش بن جاتی وہ میرے لئے جیون جیوتی
در بہ در اس کی تمازت نہ پریشاں ہوتی

میں اسے لے کے بہت دور نکل جاؤں، مگر
وہ مری راہ میں دیوار بنی بیٹھی ہے
زندگی بھر کی پرستش اسے منظور نہیں
وہ تو لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہے
میں نے چاہا تھا اسے روح کی راحت کے لیے
وہ مگر جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

نائکہ

دیکھو بٹیا' یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے

دیکھ جھٹلایا نہیں کرتے بڑے بوڑھوں کی بات
تو نہ مانے گی تو اس بازی میں کھا جائے گی مات
واری جاؤں یہ جہاں جو کچھ بھی کہتا ہے کہے
تجھ میں کوئی عیب ہے جو ایک کی ہو کر رہے
اس طرح محدود ہو جانے سے تو انکار کر
جو بھی اپنی جیب کھنکائے اسی سے پیار کر
پیار کر اس سے جو تیری چاہ میں غرقاب ہو
چاہے وہ کنجڑا ہو ' نیلاری ہو ' ہو یا قصاب ہو
تیری پڑنانی خدا بخشے بڑی ہوشیار تھیں
ایک دو کیا' وہ تو سارے شہر کی دلدار تھیں
پھر بھی لیکن آرزوئے راہ آزادی نہ کی
ان بشتن نے تو مرتے دم تلک شادی نہ کی
تیرے دل میں ہے اگر کچھ اپنے بچوں کا خیال
اپنے پیشے کو وفا داری کے جھنجھٹ میں نہ ڈال

دیکھ بٹیا' یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے

تیرے خطوں کی خوشبو

تیرے خطوں کی خوشبو

ہاتھوں میں بس گئی ہے سانسوں میں رچ رہی ہے
خوابوں کی وسعتوں ہیں اک دھوم مچ رہی ہے
جذبات کے گلستاں مہکا رہی ہے ہر سو
تیرے خطوں کی خوشبو

تیرے خطوں کی مجھ پر کیا کیا عنائتیں ہیں
بے مدعا کرم ہے ، بے جا شکائتیں ہیں
اپنے ہی قہقہوں پر برسا رہی ہے آنسو
تیرے خطوں کی خوشبو

تیری زبان بن کر ، اکثر مجھے سنائے
باتیں بنی بنائی ، جملے رٹے رٹائے
مجھ پر بھی کر چکی ہے اپنی وفا کا جادو
تیرے خطوں کی خوشبو

سمجھے ہیں کچھ اسی نے آداب چاہتوں کے
سب کے لیے وہی ہیں القاب چاہتوں کے
سب کے لیے برابر پھیلا رہی ہے بازو
تیرے خطوں کی خوشبو

اپنے سوا کسی کو میں جانتا نہیں تھا
سنتا تھا لاکھ باتیں اور مانتا نہیں تھا
اب خود نکال لائی بے گانگی کے پہلو
تیرے خطوں کی خوشبو

کیا جانے کس طرف کو چپکے سے مڑ چلی ہے
گلشن کے پر لگا کر صحرا کو اڑ چلی ہے
روکا ہزار میں نے آئی مگر نہ قابو
تیرے خطوں کی خوشبو

قمر جہاں (بھارت)

قتیل شفائی ـــ اور ـــ اردو میں گیت

دو ندیوں کا ایک کنارہ کہے کوئی
محبوب ہندوپاک کا دلدار ہے قتیل

آزادی کے بعد اردو شاعری میں جن ناموں نے ایک خاص اعتبار حاصل کیا ہے ان میں قتیل شفائی کا نام کئی لحاظ سے خاصا مقبول اور محبوب ہے۔ قتیل کا شعری کردار بڑا ہی صد پہل اور متنوع ہے' انہوں نے نظمیں لکھیں' غزلیں' گیت اور آزاد غزل بھی' وہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور شعر و ادب کے ساتھ بھی ان کا برابر کا تعلق رہا۔ گویا قتیل اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہیں۔ غالبا" یہی وجہ ہے کہ جب مدیر انشاء (کلکتہ) جناب ق ۔ س اعجاز نے قتیل شفائی پر جلد از جلد کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو بہت دیر تک میں سوچتی رہی کہ آیا قتیل کی شعری شخصیت کے کس پہلو کو موضوع بناؤں۔؟ انتخاب کا مرحلہ یوں بھی کسی قدر دشوار اور آزمائشی ہے' بہر کیف ذرا دیر کی توجہ کے بعد میں نے خامہ فرسائی کے لئے قتیل کے گیتوں کو منتخب کیا۔ اس انتخاب کے دو مضمرات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قتیل شفائی صحیح معنوں میں گیت کے شاعر ہیں' ان کی نظموں اور غزلوں پر بھی گیت کا آہنگ غالب ہے اور ان کی قابل رشک مقبولیت کا جواز بھی دراصل ان کے یہی انمول گیت ہیں۔ دوسری وجہ میرے سامنے یہ تھی کہ میں گیت کو ایک نسائی صنف تصور کرتی ہوں' یہ اور بات ہے کہ اس باب میں عام طور سے مرد قلم کاروں کی کاوشیں ہی پیش پیش رہی ہیں۔

اور "اظہار ہنر" کے تقریباً" تمام امکانات انہی کے ہاتھوں طے ہوئے ہیں لیکن مزاجاً"
اور طبعاً" گیت کی فنی کلی طور پر نسائیت سے لبریز ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں گیت کی صنف کو باضابطہ فروغ دینے اور اسے
ایک مخصوص فنی مزاج اور ادبی معیار عطا کرنے میں قتیل شفائی کے کارنامے ناقابل
فراموش ہیں۔ اب تک ان کے جو شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں ان کے نام
اس طرح ہیں۔

آموختہ، پیرہن، مطربہ، گفتگو، ہریالی، جھومر، جلترنگ، گجر، روزن اور چھتنار۔۔۔ ان میں
جھومر، گجر اور ہریالی یہ تین مجموعے قتیل کے گیتوں پر مشتمل ہیں، بقیہ مجموعوں میں
نظموں اور غزلوں کی شمولیت ہے۔

ماقبل اس کے کہ میں قتیل شفائی کے اردو گیتوں کو موضوع بحث بناؤں۔
ضروری یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں گیت کی صنف کے مزاج، اس کی صنفی
خصوصیت اور اس کے ارتقائی مراحل کا ہلکا سا تعارف پیش کر دوں۔۔

گیت کی صنف اردو شاعری میں ہندی کی شعری روایت کے زیر اثر داخل ہوئی
ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی مزاج کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہوئے
کہ "گیت" کی فضا "غزل" سے پہلے قائم ہو چکی تھی (یہاں صنفی لحاظ سے تقدم اور
تاخر کو ذہن میں نہیں رکھنا ہو گا) بقول ڈاکٹر وزیر آغا:۔

> "گیت اس وقت جنم لیتا ہے جب عورت (زمین) کا دل محبت کے
> بیج کو قبول کر لیتا ہے، دوسری طرف غزل اس بیج کے بارور اور
> ایک "نئے پیکر" کے وجود میں آنے کی داستان کو پیش کرتی ہے"
>
> ("اردو شاعری کا مزاج" از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ 235)

موصوف اپنے اس خیال کی توجیہہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ـــــ

> "چونکہ اس برصغیر کا معاشرہ مزاجاً" ارضی اور مادری ہے اس لئے یہاں
> گیت ہی اظہار ذات کی ابتدائی صورت حال کے طور پر پیدا ہوا ہے۔"

دکنی عہد میں ولی سے ماقبل کی غزلوں کا ایک بڑا حصہ گیت کے مزاج، آہنگ اور لب
ولہجہ کا آئینہ دار ہے نمونہ کے لئے قلی قطب شاہ کا صرف ایک شعر ملاحظہ ہو۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا

مختصر یہ کہ گیت نسائی جذبات و حسیات کے تحرک کا بہترین ذریعہء اظہار ہے' یہاں ذہن اور فکر کا تموج نہیں' صرف جذبات کی لہریں' موجزن ہوتی ہیں۔ اس طرح اس صنف کی وابستگی موسیقی اور رقص دونوں فنون کے ساتھ گہری ہو جاتی ہے' جس طرح ڈرامہ کا تعلق اسٹیج سے ہے اسی طرح گیت کا تعلق گانے سے ہے' جب تک اس میں موسیقی اور رقص کی تکمیل نہیں ہوتی' گیت کی کامیابی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ اردو گیتوں پر زبان اور مزاج کے اعتبار سے قدیم دکنی اردو شاعری کے گہرے اثرات مرتسم ہیں' ساتھ ہی ہندی کی شعری روایت کے اثرات بھی اس پر بڑے واضح ہیں۔

عورت کی ذات چونکہ فطری طور پر زیادہ حساس اور جذباتی واقع ہوئی ہے اس لئے گیت کی فضا بھی خالص جذباتی' حسیاتی اور عاشقانہ لے کی حامل ہے۔ اس میں ایک نوع کا والہانہ پن اور دل گداز کی کیفیت جھلکتی ہے۔ غزل کے برعکس گیت میں' مخاطب یا معشوق کا درجہ عموما" مرد کو حاصل ہے اور عورت اس کی داسی یا پجارن کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں گیت ایک مجروح دل عورت کی پکار ہے' جو پریم رس میں ڈوب کر کبھی برہا کے گیت گاتی ہے تو کبھی وصال اور کبھی انتظار کی کیفیت کو لفظ و معنی کا روپ دے کر جادواں بناتی ہے۔ نسوانی اور عوامی لب و لہجہ اور محبت کے خالص ارضی و زمینی پہلو کا احساس گیت کی بنیادی شرط ہے۔

عربی اور فارسی ادبیات میں رونے اور گنگنانے کی صدائیں تو ملتی ہیں مگر گانے اور ناچنے کی روایت ناپید ہے۔ گیت کی صنف ہندوستانی تہذیب و تمدن' یہاں کے ماحول و مناظر کی بہترین عکاس ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ کرشن اور رادھا کے عشقیہ جذبات کا اظہار ہی گیت کی اساس ہیں۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صنف کو بت پرستی کے عمل سے تعبیر گیا ہے۔

اس صنف کے آغاز کی داستان ہندوستانی لوک گیتوں سے جا ملتی ہے۔ وہ گیت جو کسی زمانے میں محض ایک بول' اظہار کی ایک تڑپ کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے' ترقی یافتہ عہد میں دیگر اصناف سخن کی ترقی و ترویج کے ساتھ ساتھ گیت بھی

جدید ہیئت میں ڈھل گئے ہیں۔ اب اس کے مزاج و انداز میں بھی قدرے تبدیلیاں آئی ہیں مگر اپنے بنیادی وصف میں یہ آج بھی ایک البیلی صنف ہے۔

گیت کے ادبی نمونوں کی تلاش میں ہماری نظر سب سے پہلے امیر خسرو پر ٹھہرتی ہے' ان کے وہ اشعار۔

زحال مسکیں مکن تغافل .... اردو گیت کے اولین ادبی نمونے قرار پائے ہیں۔ انیسویں صدی میں امانت لکھنوی کی اندر سبھا میں اردو گیت کے واضح اور دلکش نمونے موجود ہیں۔

عہد جدید میں یہ صنف پوری توانائی اور ادبی حسن کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔ اختر شیرانی' حفیظ، ساغر، شکیل بدایونی' مجروح سلطان پوری' عظمت اللہ، ساحر لدھیانوی' جمیل الدین عالی' ______ قتیل شفائی' ابن انشا اور میرا جی وغیرہ کے نام اردو گیت کے ارتقائی سفر میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو گیت کے اس تناظر میں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قتیل شفائی نے اس صنف میں اپنی انفرادیت اور فنی عظمت کے کیا امتیازی نقوش مرتب کئے ہیں۔ ذیل میں ان کے گیتوں کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ان کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی کی جا سکے: ______

گوری بیچ بجار ناچے

من ہی من تڑپے پھر بھی کر کے ہار سنگار ناچے

گوری بیچ بجار ناچے

پیٹ کی آگ بجھائے دنیا بیچ کے دین و ایمان

مجبوری جب کرے اشارہ ناچے ہر انسان

چاندی کی جھنکاروں کے سنگ ناچے سب سنسار ناچے

گوری بیچ بجار ناچے ....

______

سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا آئینہ توڑ دے

تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا آئینہ توڑ دے

تری نیندیں لٹیں
تیرے سپنے لٹے

گوری کیوں ہے تو بے کل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا
ناچ اری تو بن پائل۔ ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا

قتیل کے گیتوں میں عورت کی مظلومیت کا عکس بڑے بھرپور رنگ میں ابھرا ہے۔ عورت جو ہمارے معاشرے میں صرف تفریح طبع کا ایک کھلونا ہے' جو من ہی من میں تڑپتی ہے' مگر پھر بھی گھنگھرو پہن کر ناچنے پر مجبور ہے۔ پیٹ کی آگ کس طرح دین و ایمان کو گھائل کر رہی ہے' چاندی کی جھنکاروں میں کیسی کشش ہے۔ قتیل کے گیت اسی مجبوری اور ظلم کی کہانی کو سناتے ہیں' لیکن ان کے گیتوں کے اور بھی رنگ ہیں' ملاحظہ ہو۔

میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے! ساون کا بادل یاد آ رہا ہے
یتیم نے مجھ کو ململ منگا دی میری خوشی کی دنیا بسا دی
رنگ اس کی خاطر میں نے منگایا ابرک ملا کر اس کو لگایا

تارے فضا میں چمکا رہا ہے
میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے

آکاش کا رہنے والا تھا!
اب دھرتی پر آباد ہوں میں
جنت سے جو نکلا تیرے لیے
اس آدم کی اولاد ہوں میں

دو دل جب دو انسانوں کے مل کر دھڑکے تھے
اس دن سے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

یہ دنیا جب تک باقی ہے
میں تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا
تیرے آنچل کے اک جھونکے سے
رخ طوفانوں کا موڑوں گا

جس دن سے پیار کی رسم چلی اے جان تمنا
اس دن سے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قتیل شفائی نے گیت کو صرف ساز تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے اسے زندگی بنا دیا ہے۔ بقول فراق گورکھپوری "قتیل کے نغموں ...... میں حیات بجتی ہے"۔ قتیل کے گیت بھی مجروح زندگی کی پکار ہیں، ان میں درد، کسک، تڑپ بے چارگی، گھٹن اور ایک بے چین، الھڑ جوانی کے تمام مرتعش جذبات پنہاں ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی کشش بھی لازوال ہے۔ قتیل شفائی کی شاعری کا مرکزی کردار عورت ہے، خصوصاً" طوائف جسے انہوں نے مطربہ کا خوبصورت نام دیا ہے وہ مرکزی کردار عورت کی نفسیاتی کے بڑے اچھے نباض ہیں۔

قتیل کے گیت میں سادگی اور نغمگی کی جو بہار ہے وہ بھی ان کی منفرد پہچان بناتی ہے۔ حفیظ، اختر شیرانی اور فیض کی طرح قتیل کا مزاج بھی سراسر رومانی ہے۔ مگر ترقی پسند جماعت کی وابستگی نے ان کے نغموں کو ایک صحت مند معنویت بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ قتیل محض رومانی شاعر ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کا رومان زندگی کی سرحد میں دور تک پھیلتا چلا گیا۔ اس کی حیثیت اس شجر سایہ دار کی ہو گئی، جو زندگی کے سفر میں جھلستے ہوئے مسافر کو لمحاتی قرار عطا کرتا ہے۔ چھتنار، ہریالی، مطربہ -- ان کے مجموعوں کے نام ہی ان کی ذہنی کیفیت کے مظہر ہیں۔ چھتنار کے پیش لفظ میں انہوں نے اپنے نظریہ فن کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجے میں بات کرنا بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اگر زمین سے ہمارا ناطہ ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے تو ہمیں اس کی مٹی کے مزاج سے آنکھیں

نہیں پھیرنی چاہئیں۔"

زمین کے ساتھ رشتہ تو ہم سب کا ہے مگر اس رشتہ کا ایسا شعور اور اتنا گہرا احساس، ساتھ ہی مٹی کے مزاج کی شناخت، شاید بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ گیت کا مزاج بھی چونکہ خالص زمینی اور ارضی ہے اس لئے قتیل کے شعری مزاج کے ساتھ اس کا میل کھانا عین فطری ہے ______ خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق صنف سخن کا بھی انتخاب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قتیل اپنے گیتوں میں خوب چمکے ہیں، ان کی نظموں اور غزلوں پر بھی گیت کا مزاج حاوی ہے۔ فلمی دنیا کی وابستگی نے ان کو عوام سے قریب کیا اور اس عوامی اور انسانی لب و لہجہ نے قتیل کے گیتوں کو معنوی وسعت اور صوتی حسن عطا کیا ہے۔

قتیل شفائی کے گیتوں میں ایک خاص نوعیت کی جھنکار اور ایک انوکھی نغمگی کا احساس ہوتا ہے، جس کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال یہ ہے کہ ____

"... قتیل کے گیت میں عورت اس پنچھی کی طرح ابھری ہے کہ جسے تازہ تازہ پر عطا ہوئے ہوں اور جو ابھی اڑنے کے قابل تو نہ ہوئی ہو تاہم جس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نے نغمے میں ایک انوکھی جھنکار کا اضافہ، ضرور کر دیا ہے ...."

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک رقص مجسم کی کیفیت ان کے نغموں میں ہے، ان کے یہاں محض جذبے کا سیدھا سادا بیان نہیں بلکہ جسم کی پکار اور اس کی لغزش تک پنہاں ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری کی طرح قتیل شفائی کے گیتوں میں بھی پیکر سازی کا ایک اچھوتا حسن ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

انوکھی سی کوئی تصویر دل کو گد گداتی ہے
نہیں ہے سامنے کوئی مگر آواز آتی ہے

لے پی لے تو بھی دکھیارے کہتی ہے سلونی شام

ایک جام کھنکتا جام، اٹھا لے جام، کھنکتا جام

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اکی تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال
ہر آنگن میں سجے نہ تیرے اجلے روپ کی دھوپ
چھیل چھبیلی رانی تھوڑا گھونگھٹ اور نکال

میں چھمک چھمک لہراؤں (یا)
جھن جھن جھن جھن تجھے سناؤں تیرا ہی افسانہ

گیت کے ان تمام بولوں میں جو صوتی تحریک ہے اور جو تصویر الفاظ کے وسیلے سے آنکھوں اور کانوں تک پہنچ جاتی ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔ گیت اور رقص یوں بھی ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ قتیل نے اپنے گیتوں میں اسے ایک لازمی جزو قرار دیا ہے۔ یہ ان کی ایسی کامیابی ہے جس کی مثال اردو گیت میں عام طور پر نایاب ہے۔ وہ اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں کہ الفاظ کے زیر و بم پر قاری کے جذبات و حسیات کو کس طرح رقص کناں رکھا جائے۔ لفظوں اور تراکیب کا مناسب اور بر محل استعمال، مصرعوں کا گھٹانا اور بڑھانا، ٹیک کی پنکتی میں ردم کا بھرپور احساس، ان کے گیتوں میں ایک خاص کیفیت بیدار کرتا ہے۔ قتیل شفائی کے یہاں پورا ماحول نغموں کی جھنکار میں تھرکتا اور ڈوبتا محسوس ہوتا ہے۔

عشق ایک ابدی جذبہ ہے۔ گیت کا موضوع بھی یہی عشق ہے۔ عورت اور مرد اس عشق کے دو اہم کردار ہیں، گیت کا وصف یہ ہے کہ یہاں عاشق اور معشوق کے کردار کو مسخ نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو ان کی فطری خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں نیچرل شاعری کی بھرپور خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں تکلف اور

تصنع نہیں، نہ زبان کے معاملہ میں نہ جذبات کی پیشکش کے معاملہ میں، ہر جگہ ایک ایسی سادگی، ایک ایسی بے ساختگی اور بے محابہ پن ہے جس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

گیت کی فضا میں دیہی حسن (RUSTIC BEAUTY) کا احساس ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دیہی مناظر کا بیان، یہاں کی الہڑ جوانیوں کا اضطراب، یہ سب کچھ اس صنف میں موجود ہے۔ قتیل نے اپنے گیتوں میں ان تمام خوبیوں کا لحاظ رکھا ہے۔ کسی بھی فنی تجزیہ کی پیش کش کے وقت قتیل شفائی کو صوت و آہنگ کے تقاضوں کا ہمیشہ پورا خیال رہا ہے، حتی کہ آزاد غزل کے تجربے میں بھی ان کی نظر اس امر پر رہی کہ۔ ہیتی تجربہ ضرور ہو مگر غزل کی نغمگی مجروح نہ ہو ....." اسی طرح گیت میں بھی انہوں نے نغمگی پر بہت زیادہ توجہ دی ہے اور باضابطہ اس خوبی کا التزام کیا ہے کہ گیت کے بول نغمہ اور رقص کے تقاضے سے جدا نہ ہوں۔ یہ ان کا ایک یادگار کارنامہ ہے کہ انہوں نے شاعری اور موسیقی کے رشتہ کو جوڑنے کا کام کیا ہے، ورنہ نئے عہد میں شاعری موسیقی سے دور ہوتی جا رہی تھی، ان کی بے پناہ مقبولیت کا جواز بھی انہی خوبیوں میں ہے۔

قتیل نے معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے گیت کے فن میں اضافہ کیا ہے۔ جھومر میں کل ملا کر پچاس گیت شامل ہیں۔ دوسرے مجموعوں میں بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان کی روشنی میں یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ انہوں نے جہاں ایک طرف گیت کی جدید ہیئت کا لحاظ رکھا ہے وہاں قدیم روایت سے استفادہ بھی کیا ہے اور اس صنف کے وسیع سے وسیع تر امکانات پر ان کی نظر رہی ہے۔ وہ اس میں تنوع بھی لائے۔ یہ تنوع کبھی نئی لسانیاتی تشکیل کے ذریعہ، کبھی انوکھے اور البیلے پیکروں کی اختراع سے کبھی حسن تراکیب اور ہندی کے کومل اور شیریں الفاظ کے استعمال کے وسیلے سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کے گیتوں میں ایک سدا بہار کیفیت کے حامل بنے ہیں۔ اس امر میں دو رائیں نہیں کہ قتیل ایک دلدار شاعر ہیں اور اس دلداری کا بہت کچھ انحصار ان کے گیتوں پر ہے۔

کیسے نین ملا کر چین ملا
کھا لاکھ تجھے کہیں دل نہ لگا

اب ٹھنڈی آہیں بھر پگلی
جا اور محبت کر پگلی

تو نے پیار کے نغمے چھیڑے تھے
پر کھو گئی غم کے راگ میں تو
وہ آگ وئی نہ دیکھ سکا
چپ چاپ جلی جس آگ میں تو
اب آگ سے دامن بھر پگلی
جا اور محبت کر پگلی

پگلی اس پیار کی راہوں میں
کیوں کوئی کسی کو اپنائے
اس دنیا کی ہے ریت یہی
جسے پیار کرو وہی ٹھکرائے
کھا ٹھوکر پر ٹھوکر پگلی
جا اور محبت کر پگلی!

کل دل میں بسایا تھا جسکو
وہی چین ترا اب لوٹے گا

کچھ اور ہنسے گی یہ دنیا
کچھ اور ترا دل ٹوٹے گا

بے موت گئی تو مر پگلی
جا اور محبت کر پگلی

الفت کی نئی منزل کو چلا تو باہیں ڈال کے باہوں میں--!
دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں
کیا کیا نہ جفائیں دل پہ سہیں' پر تجھ سے کوئی شکوہ نہ کیا
اس جرم کو بھی شامل کر لو' میرے معصوم گناہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل' ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں
جب چاندنی راتوں میں تو نے' خود ہم سے کیا اقرار وفا
پھر آج ہیں کیوں ہم بیگانے' تیری بے رحم نگاہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل' ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں
ہم بھی ہیں وہی تم بھی ہو وہی یہ اپنی اپنی قسمت ہے
تم کھیل رہے ہو خوشیوں سے' ہم ڈوب گئے ہیں آہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل' ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

دل دیتا ہے رو رو دہائی ـ کسی سے کوئی پیار نہ کرے
بڑی مہنگی پڑے گی جدائی ـ کسی سے کوئی پیار نہ کرے
کوئی سمجھے کسی کو نہ اپنا
جھوٹا نکلے گا جیون کا سپنا
گاؤں گاؤں پکارے شہنائی
کسی سے کوئی پیار نہ کرے
سیج پر بیٹھی روئے دلہنیا
بسے پیتم کے من میں سوتنیا
ہائے نکلا بلم ہرجائی۔
کسی سے کوئی پیار نہ کرے
کوئی سویا ہے ماٹی کے نیچے
کوئی بھاگے ہواؤں کے پیچھے
لائی دل کی لگن رسوائی
کسی سے کوئی پیار نہ کرے

مجھے آئی نہ جگ سے لاج ۔ میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

کچھ مجھ پہ نیا جوبن بھی تھا
کچھ پیار کا پاگل پن بھی تھا
کبھی پلک پلک مری تیر بنی
کبھی زلف مری زنجیر بنی
لیا دل ساجن کا جیت ۔ وہ چھیڑے پائلیا نے گیت
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

میں بسی تھی جس کے سپنوں میں
وہ گنے گا اب مجھے اپنوں میں
کہتی ہے مری ہر انگڑائی
میں پیا کی نیند چرائی
میں گئی تھی بن کے چور --- مگر مری پائل تھی کمزور
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

دھرتی پہ نہ میرے پیر لگیں
بن پیا مجھے سب غیر لگیں
مجھے رنگ ملے ارمانوں کے
مجھے پنکھ ملے پروانوں کے
جب ملا پیار کا گاؤں --- تو ایسا لچکا میرا پاؤں

کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

یہ وادیاں، یہ پربتوں کی شاہزادیاں
پوچھتی ہیں کب بنے گی تو دلہن؟
میں کہوں جب آئیں گے مرے سجن
مرے سجن----- چلا بھی آ

آ بھی جا کہ میں نے آج تیرے واسطے
پھر سجائے ہیں زندگی کے راستے
دور اب نہیں ہے پیار کا حسیں محل
گیسوؤں کی چھاؤں چھاؤں میرے ساتھ چل
گونج اٹھی ہیں دل میں جھا نجھنیں چھننن چھننن
مرے سجن----- چلا بھی آ

کیوں ہوا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر
خواب کوئی دیکھتا ہے جاگ جاگ کر
اپنے گرم بازوؤں میں تجھ کے تھامنے
دیکھ میں کھڑی ہوں کب سے تیرے سامنے
سن رہی ہوں تیرے سانس کی سنن سنن
مرے سجن----- چلا بھی آ

اڑا رہا ہے پیار بدلیوں کے بھیس میں
یہ سماں کہاں بھلا پرائے دیس میں
ہر طرف یہاں ہیں زندگی کی راحتیں
میری دھڑکنوں میں کھنکھنائیں چاہتیں
بج رہی ہوں جیسے چوڑیاں کھنن کھنن
مرے سجن----- چلا بھی آ

یہ محفل جو آج سجی ہے
اس محفل میں ہے کوئی ہم سا؟
ہم سا ہو تو سامنے آئے------

آنچ ہمارے حسن کی پا کر شعلوں کو بھی آئے پسینہ
آنکھ اٹھا کر ہم دیکھیں تو پتھر کا بھی دھڑکے سینہ
ہم نے آنکھوں کی مستی سے نئے نئے ساغر چھلکائے
ہم سا ہو تو سامنے آئے------

پیار کی محرومی کا شکوہ اور ہی لوگ کیا کرتے ہیں
اس دنیا میں جو چاہیں ہم تو چھین لیا کرتے ہیں
پھول سے ہم نے خوشبو چھینی، سیپ سے ہم نے موتی پائے
ہم سا ہو تو سامنے آئے------

سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا' آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا' آئینہ توڑ دے

تیری نیندیں لٹیں' تیرے سپنے لٹے
جو بھی نغمے لٹے' تیرے اپنے لٹے
تیرا تن لٹ گیا' تیرا من لٹ گیا
تو لٹی اور تیرا چلن لٹ گیا' آئینہ توڑ دے

اب وہ غنچے کہاں اب وہ کلیاں کہاں
وہ بہاریں کہاں' رنگ رلیاں کہاں
باغ سونے ہوئے' رنج دونے ہوئے
آج ایک ایک سرو و سمن لٹ گیا' آئینہ توڑ دے

اپنا دل بیچ کر' اپنا گھر بیچ کر
اپنی ہر سانس کو' دربدر بیچ کر
آج اکیلی ہے تو' اک پہیلی ہے تو
تیرا سب کچھ سر انجمن لٹ گیا' آئینہ توڑ دے!

جس دن سے پیا دل لے گئے ___ دکھ دے گئے
اس دل سے گھڑی پل ہائے ___ چین نہیں آئے
جب چہکیں پنچھی شام کے
رہ جاؤں میں دل کو تھام کے
کروں بین تمہارے نام کے
آنسو اب کس کام کے

لوٹا ہے تمہارے پیار نے ____ اقرار نے
بیٹھی ہوں میں آس لگائے ____ چین نہیں آئے

آرام نہیں میرے بھاگ میں
میں تو کھو گئی غم کے راگ میں
دل جلتے جلتے جل گیا
پیار کی ٹھنڈی آگ میں
جب یاد تمہاری آ گئی ____ تڑپا گئی
میرے دکھیا نین بھر آئے ____ چین نہیں آئے

امبوا کی ڈاریوں پہ جھلنا جھلا جا
اب کے ساون تو سجن گھر آ جا

تجھ بن میرا من بیکل ہے
سو سو برس کا اک اک پل ہے
دن میں گزاروں کیسے اتنا بتا جا
اب کے ساون تو سجن گھر آ جا

بچھڑ گیا ہو جس کا ساتھی
وہ اک دیپک ہے بن باتی
غم کا اندھیرا میرے من سے مٹا جا
اب کے ساون تو سجن گھر آ جا

یاد جو آئیں دن بچپن کے
روئیں نیناں مجھ برہن کے
ترس گئی ہوں' موہے درس دکھا جا
اب کے ساون تو سجن گھر آ جا

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

تو ملا ہے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو
یہ مری عمر محبت کے لئے تھوڑی ہے
اک ذرا سا غم دوراں کا بھی حق ہے جس پر
میں نے وہ سانس بھی تیرے لئے رکھ چھوڑی ہے
تجھ پہ ہو جاؤں گا قربان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

اپنے جذبات میں نغمات رچانے کے لئے
میں نے دھڑکن کی طرح دل میں بسایا ہے تجھے
میں تصور بھی جدائی کا بھلا کیسے کروں؟
میں نے قسمت کی لکیروں سے چرایا ہے تجھے
پیار کا بن کے نگہبان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

تیری ہر چاپ سے جلتے ہیں خیالوں میں چراغ
جب بھی تو آئے جگاتا ہوا جادو آئے
تجھ کو چھولوں تو پھر اے جان تمنا، مجھ کو
دیر تک اپنے بدن سے تری خوشبو آئے
تو بہاروں کا ہے عنوان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی مری جاں تجھے چاہوں گا

کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جان تمنا
بھیگے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

یہ رات، یہ برسات، یہ ساون کا مہینہ
ایسے میں تو شعلوں کو بھی آتا ہے پسینہ
اس رت میں غریبوں کی دعا کیوں نہیں لیتے
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

دیکھو تو ذرا جھانک کے باہر کی فضا میں
برسات نے اک آگ لگا دی ہے ہوا میں
اس آگ کو سینے میں بسا کیوں نہیں لیتے!
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

آیا ہے کسے راس جدائی کا یہ عالم
تڑپیں گے اکیلے میں ادھر آپ ادھر ہم
دل سے دل مری جان ملا کیوں نہیں لیتے
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

حسن رضوی

مشہور گیت نگار اور شاعر قتیل شفائی سے انٹرویو

س : یہ فرمائیے کہ آپ اورنگ زیب خان سے قتیل شفائی کیسے بنے اور کن کن مراحل سے گزرے؟

ج : جس عہد نے مجھے باقاعدہ شاعر بن جانے کی سند عطا کی، اس عہد کا دستور تھا کہ باقاعدہ شاعری کرنے سے پہلے ماں باپ کے رکھے ہوئے نام کو ایک تخلص میں تبدیل کر لیا جاتا۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا، اور اس عمل میں مجھے کسی بھی قابل ذکر مرحلے سے گزرنا نہیں پڑا۔

س : آپ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اس کا خاص کوئی سبب؟

ج : اس کا بڑا سبب صرف ایک ہی تھا کہ میں ایک امیر کبیر باپ کا بیٹا تھا جن کا میرے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ اور میرے امیر کبیر قبیلے میں سے کسی ایک کو بھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ مجھے تعلیم کی اگلی منزلوں کا راستہ بتاتا۔ بلکہ سب نے کہا کہ اس لڑکے کو آگے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے اب اسے کاروبار میں ڈال دینا چاہئے چنانچہ اس نیک مشورے نے مجھے کم علمی کے جنہم میں دھکیل دیا، لیکن میری یہ کم علمی، تدریسی اداروں تک محدود رہی۔ میں نے ذاتی حیثیت میں بہت مطالعہ کیا، بہت لٹریچر پڑھا۔ جس نے میری شاعری کو جلا بخشی،

س : جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ آپ کی تعلیم واجبی سی ہے، یہ بتائیے کہ آپ کے نزدیک ایک نامور ادیب اور شاعر بننے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا

ضروری ہے؟

ج: اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا تو کسی شخص کے لئے بھی ازحد ضروری ہے۔ چاہے وہ ادیب ہو یا غیرادیب ــــ لیکن کوئی یہ سمجھ لے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا ہر شخص ادیب یا شاعر بن سکتا ہے تو یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اگر اعلیٰ تعلیم (تدریسی اداروں کی) اور شعر و ادب کو لازم و ملزوم قرار دے دیا جائے تو پھر میر و میرزا سے لے کر حفیظ و جگر تک بہت سے نامور شعراء کو گوشۂ گمنامی میں رہنا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ایک اچھے خلاق ادب کو اعلیٰ تعلیم سونے سے کندن بنا دیتی ہے۔

س: آپ نے اپنی شعری تربیت میں کن کن شعراء سے استفادہ کیا؟

ج: میری شعری تربیت میں ابتدا" حضرت حکیم محمد یحیٰی شفا کی شفقتیں شامل تھیں اور اسی نسبت سے شفائی میرے تخلص کا لاحقہ ہے اور اس کے بعد حضرت احمد ندیم قاسمی کی عنایتیں میرے شامل حال رہیں' جنھوں نے ہمیشہ میری رہنمائی فرمائی۔

س: اور اب یہ بھی فرما دیجئے کہ آیا آپ سے بھی کسی نے استفادہ کیا؟

ج: مجھ سے استفادہ کرنے کے تمنائی اتنے پیدا ہوئے کہ اگر میں اپنے حلقۂ تلمذ میں لیتا جاتا تو آج ان کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی لیکن میں نے اپنے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا اور استادانہ مشاغل سے دور ہی رہا۔ ہاں دو چار ایسے عزیز ضرور ہیں جنہیں میں ضروری مشورے دیتا ہوں' لیکن انہیں شاگرد نہیں کہتا دوست کہتا ہوں' یہ الگ بات ہے کہ وہ مجھے اپنا استاد سمجھتے ہیں۔

س: ادبی دنیا سے فلمی دنیا کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

ج: ادبی دنیا سے فلمی دنیا کی طرف مائل ہونے کی داستان سادہ تو ہے رنگین نہیں۔ ہوا یوں کہ غالبا" نومبر 46 میں گارڈن کالج کا مشاعرہ پڑھنے کے بعد جب میں گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو مجھے دو واقف کار نوجوانوں نے روک لیا اور مجھے بتایا کہ وہ بمبئی میں ایک فلم بنا رہے ہیں۔ جس کے لئے وہ مجھ سے گیت لکھوانے کے تمنائی ہیں۔ میں نے ہاں کر دی اور ضروری شرائط

طے ہونے کے بعد میرا بمبئی جانا پکا ہو گیا۔ لیکن بمبئی میں مذہبی فسادات کا سلسلہ طویل ہو جانے کے باعث تمام پروڈکشن کو لاہور منتقل ہونا پڑ گیا اور میں ٹھیک یکم جنوری 47ء کو لاہور پہنچا۔ اور پھر اس روز سے آج تک لاہور ہی میں ہوں۔ اور آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ مجھے فلم انڈسٹری میں لانے والے واقف کار نوجوان اب اس دنیا میں نہیں ہیں' لیکن ان کے ناموں سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ ان میں سے ایک محبوب اختر مرحوم تھے اور دوسرے امان اللہ خان نیازی مرحوم تھے جو اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرکزی سیکرٹری دفاع تھے۔ یہ دونوں دوست ابتدا میں فلم کو اپنی پہچان بنانا چاہتے تھے' لیکن تقسیم ملک نے ان سے ان کی یہ تمنا چھین لی۔

س : شاعری کے ساتھ ساتھ کیا کبھی اداکاری کا شوق نہیں ہوا حالانکہ آپ خود بھی فلم سازی کر چکے ہیں؟

ج : یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ ہر نوجوان کو اپنے آغاز شباب کے آئینے میں ایک ہیرو دکھائی دیتا ہے' لیکن یہ جنون مجھے بہت کم رہا۔ شاید اس لئے کہ مجھے بچپن میں گانے کا شوق تھا اور میری کوشش تھی کہ میرا شمار اچھے شوقیہ گلوکاروں میں ہونے لگے۔ یہ بات اس زمانے کی ہے کہ جب راولپنڈی میں گھر گھر گانے کا چرچا تھا اور اچھے گھروں کے پڑھے لکھے نوجوان قدامت سے بغاوت کر کے جدید راہ حیات پر گامزن ہو رہے تھے اور میراثی ہونے کا طعنہ سننے کے باوجود وہ گانے کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ اور انہی پڑھے لکھے نوجوانوں میں ایک بہت ہی خوبصورت اور سجیلا نوجوان رفیق غزنوی بھی تھا جو راولپنڈی سے چل کر لاہور میں رکا اور پھر بمبئی میں اس نے اپنی صلاحیتوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ وہ ہیرو بھی تھا' گلوکار بھی تھا اور موسیقار بھی' اس کی دی ہوئی موسیقی فلم "سکندر" میں آج بھی اس کی یاد دلاتی ہے اور شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اپنے وقت کا یہ خوبصورت ترین اور مقبول ترین شخص رفیق غزنوی آج کی ہیروئن سلمیٰ آغا کا نانا تھا۔ چنانچہ رفیق غزنوی جیسے سلجھے ہوئے نوجوان کی وجہ سے راولپنڈی میں ایک خوبصورت فضا موسیقی کے

لئے تیار ہو چکی تھی' میں بھی اس سے متاثر تھا' لیکن تھوڑے ہی دنوں میں مجھے اپنے شاعر ہونے کا سراغ ملا تو میری توجہ بٹ کے رہ گئی اور پھر کچھ مزید مدت گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے شوق گلوکاری میں اور ذوق شاعری میں ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے کہ یہ دونوں مل جل کر میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ چنانچہ میں ایک مترنم شاعر بن گیا اور اداکاری اور گلوکاری میری دست برد سے بچ گئیں۔

س : سنا ہے آپ کے گیتوں کے اکثر بول دوسرے شاعر بھی استعمال کر لیتے ہیں یا یہ کہ کئی شعراء کو آپ نے بھی مکھڑے لکھ کر دیئے ہیں۔ اس بارے میں کچھ بتائیں گے؟

ج : اس بارے میں کیا عرض کروں پچھلے برس انڈیا سے ندا فاضلی کراچی آئے ہوئے تھے۔ ندا فاضلی بہت کھرے اور تیکھے انسان ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ انڈیا میں میرے کلام کو نہ صرف چرایا گیا ہے بلکہ لوٹا گیا ہے۔ چونکہ دونوں ملکوں کے درمیان کاپی رائٹ ایکٹ موجود نہیں اور دونوں ملکوں کے لئے ضابطہ اخلاق ایک بے معنی چیز ہے اس لئے کوئی بھی لٹنے والا اپنے لوٹے جانے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنی مرضی سے میں نے اگر کسی دوست شاعر کی شعری مدد کی ہے تو اسے میں ایک ضرورت مند دوست سے تعاون سمجھتا ہوں۔

س : ایک مشہور شاعر کا ایک قومی نغمہ جو کہ ہمارے ہاں ریڈیو اور ٹی وی پر بہت مقبول ہوا۔ سنا ہے آپ کا تحریر کردہ ہے؟

ج : جی نہیں' یہ افواہ اس سکینڈل کا حصہ ہے جو بعض لوگوں نے مذکورہ شاعر کو نقصان پہنچانے کے لئے ماضی میں کھڑا کیا تھا اور جس کی تردید میری طرف سے بار بار کی جا چکی ہے۔

س : آپ کا پہلا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟

ج : میرا پہلا مجموعہ کلام میرے ان گیتوں پر مشتمل تھا جو میں نے قیام پاکستان سے پہلے نو مشقی کے عالم میں لکھے تھے اور یہ مجموعہ 46ء میں بہاول

پور سے شائع ہوا تھا' اور اس کا نام "ہریالی" تھا اب تک اس کے سات ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

س: اور اس کے بعد اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج: کل گیارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہریالی ' گجر' جلترنگ' روزن' جھومر' مطربہ' گفتگو' چھتنار' پیراہن' آموختہ اور ابابیل ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے اور اپنے تمام مجموعوں کا انتخاب ان کے علاوہ ہے!

س: ان شعری مجموعوں میں آپ کے خیال میں کونسا مجموعہ زیادہ مقبول ہوا۔؟

ج: ماضی میں "گجر" اور حال میں "آموختہ"

س: کچھ ناقدین فلمی شاعری کو ادب کا حصہ نہیں سمجھتے ' ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ فلمی شاعری میں بھی شاعری کے نادر نمونے ملتے ہیں؟

ج: وہ کچھ ناقدین جو فلمی شاعری کو ادب کا حصہ نہیں سمجھتے ایسے نقادوں کو سچ بولنے کی توفیق نہیں' اگر وہ دیانت داری سے فلم اور ادب کا مطالعہ کریں تو ان پر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ تک بندی صرف فلم ہی کا مقدر نہیں بلکہ ادب میں بھی اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ بیس پچیس برس پہلے تقریباً" ہر اچھا شاعر فلم میں آنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے جب اسے کامیابی حاصل نہیں ہوتی تھی تو وہ فلم میں معیاری شاعری پیش کرنے والے شعراء کو "فلمی شاعر" ہونے کا طعنہ دے کر آسودگی حاصل کرتا تھا۔ "باسی کڑھی" میں ابال دیکھئے کہ ابھی حال ہی میں کسی نے پھر مجھے فلمی شاعر کہہ کر خدا جانے اپنی کس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اپنی ادبی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی فلمی شاعری پر بھی ناز کرنے کا اعلان کرتا ہوں اور اپنے قارئین کو منصف بناتے ہوئے پوچھتا ہوں کہ کیا فلم میں معیاری شاعری نہیں ہو سکتی۔ کیا ادب میں بری شاعری موجود نہیں؟ اصل بات تو یہ ہے کہ شعر کو اچھا ہونا چاہئے۔ وہ فلم میں ہو یا ادب میں---

س: آپ کے نزدیک ہندو پاک کے وہ کون سے فلمی شاعر ہیں جن کی تخلیقات

اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں؟

ج : انڈیا سے شروع کروں تو آرزو لکھنوی، کیدار شرما، پردیپ، راجندر کرشن، تنویر نقوی، ندا فاضلی، مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی، اندی ور، کیفی اعظمی، نقش لائلپوری، قمر جلال آبادی، اور ساحر لدھیانوی نے اکثر و بیشتر معیاری نغمہ نگاری کی ہے۔ اور پاکستان میں سیف الدین سیف، تنویر نقوی، احمد راہی، ساغر صدیقی، طفیل ہوشیار پوری، کلیم عثمانی اور کچھ اور لوگوں نے باقاعدہ فلم کو معیار کے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی، لیکن سیف، تنویر اور راہی کا نام مجھے خصوصیت سے لینا چاہئے۔ میں نے فلم میں ادب کی کامیاب اور قابل فخر پیوند کاری کی ہے۔ جن شعراء کی پہلے سے لکھی ہوئی دو چار غزلیں فلموں میں آگئیں، میں نے ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا کہ انھوں تسلسل کے ساتھ فلم کے لئے براہ راست کچھ نہیں لکھا۔

س : آپ نہ صرف ادبی دنیا بلکہ فلمی دنیا کے بھی نامور شاعر ہیں اور آپ نے بہت سے ایسے گیت لکھے ہیں جو شعر و ادب کی اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں۔ یہ فرمایئے ہماری ادبی دنیا کے چند ایسے شاعر جنھوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا لیکن وہ اس طرح کامیاب نہیں ہو سکے جیسے آپ، اس کی وجہ کیا ہے؟

ج : اس کی وجہ یہ ہے کہ فلم کے لئے اچھی شاعری تخلیق کرنے کے لئے جس غنائی مزاج کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کچھ شعراء کو نصیب نہیں ہوتا۔ اور پھر یوں بھی ہے کہ فلم میں صرف غزل سے کام نہیں چلتا، وہاں گیت اور نظم پہ دسترس ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ نغمہ نگاری ایک ہمہ وقتی کام ہے، اسے جزوقتی مشغلے کے طور پر جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اچھی فلمی شاعری کی تخلیق بہت وقت چاہتی ہے۔

س : ابتدا سے لے کر اب تک کن کن شعراء سے آپ کی خاص رفاقت رہی ہے؟

ج : یہ ایک لمبی چوڑی فہرست کی بات چھیڑ دی ہے آپ نے، کس کس کا نام لوں اور کس کس کو نظر انداز کروں، بس رہنے ہی دیجئے اس موضوع کو۔

س : ایک زمانے میں جو شعراء آپ کے بہت دوست ہوا کرتے تھے آج کل آپ کے بہت دور ہیں۔ مثال کے طور پر منیر نیازی' احمد ظفر' مظفر وارثی وغیرہ

ج : دوست کو دوست سے شکایت ہو سکتی ہے۔ اگر میرا کوئی دوست مجھ سے دور ہو گیا تو مجھے اس کا دکھ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے ہی کوئی قصور ہوا ہو گا' ورنہ میرے دوست تو کبھی ایسے نہ تھے۔

س : چلئے یہ وضاحت تو ہو گئی' آپ کا تعلق ترقی پسند مصنفین سے ہے' یہ بتائیں کہ موجودہ عہد میں کتنے ایسے ترقی پسند ادیب اور شاعر ہیں جو اب تک ترقی پسندی کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں؟

ج : ترقی پسندی کے تقاضے کیا ہیں؟ اس بات کا فیصلہ کون کرے؟ اکثر شعراء ادباء کی اپنی الگ الگ ترقی پسندی ہے' کوئی ایک انتہا پر ہے تو کوئی دوسری انتہا پر اور پاکستان میں جمہوری عمل کے بار بار مجروح ہونے کے سبب یہاں تو اتنی سی ترقی پسندی بھی بہت ہے کہ جمہوریت کی بقا کے لئے جدوجہد کی جائے' تاکہ مکمل جمہوریت کی بحالی کے بعد ترقی پسندی کے ارفع و اعلیٰ مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔ سو میرے خیال میں اس حد تک تو ادباء و شعراء کی اکثریت ترقی پسندوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

س : آپ پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری رہ چکے ہیں لیکن اب آپ گلڈ سے بہت دور ہیں اس کی وجہ؟

ج : جی ہاں میں رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان کا دو بار سیکرٹری منتخب ہو چکا ہوں' اور اس کے لئے میں نے زندگی کے آٹھ قیمتی سال وقف کئے۔ کیونکہ اس وقت گلڈ ایک فعال ادارہ تھا اور اس کی ہمیں ضرورت تھی۔ اب گلڈ کیا ہے ؟ یہ آپ بھی جانتے ہیں؟

س : کیا گلڈ جن مقاصد کے لئے قائم کی گئی تھی' ان مقاصد کو پورا کر رہی ہے ؟

ج : جن مقاصد کے لئے گلڈ قائم کی گئی تھی' وہ مقاصد ماضی میں بہت حد تک

حاصل ہو گئے تھے۔

س : اکادمی ادبیات پاکستان ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کردار ادا کر رہی ہے؟

ج : چونکہ میں اس ادارے سے کوئی تنظیمی وابستگی نہیں رکھتا اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ اس سوال کا جواب اکادمی ادبیات کے چیئرمین سے براہ راست مانگیں۔

س : حکومتی سطح پر خاص خاص ادیبوں اور شاعروں کو خاص خاص طریقوں سے نوازا بھی جاتا ہے۔ کیا آپ ایسے شعراء میں شامل ہیں' اگر نہیں تو کیوں نہیں۔ اور جو لوگ نوازے جاتے ہیں وہ کیوں؟

ج : میں ایسے شاعروں میں ہرگز شامل نہیں۔ کیوں' اس کی مجھے کوئی خبر نہیں اور جو لوگ نوازے جاتے ہیں۔ وہ کیوں نوازے جاتے ہیں' اس کا راز صرف نوازے جانے والے حضرات ہی جانتے ہیں۔

س : ہمارے ملک میں مزاحمتی شاعری کے نمائندہ شعراء کون ہیں؟

ج : اب تو ان تعداد بڑھ چکی ہے' لیکن بڑے نام صرف دو ہیں۔ حبیب جالب ' احمد فراز احمد فراز' حبیب جالب!

س : قتیل صاحب! آپ نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی بہت سے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ یہ فرمائیے کہ مشاعرے شاعری کے فروغ میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

ج : مشاعروں کی افادیت سے انکار نہیں' لیکن داد حاصل کرنے کی کوشش میں نچلی سطح کا کلام پیش کرنا اور پہلے سے مقبول تخلیقات کو سالہا سال تک بار بار سنانے کے رجحان نے مشاعرے کی افادیت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ مشاعرہ تو سامعین کے لئے نئی سے نئی بات بننے کا ذریعہ ہونا چاہیے اور اونچے خیالات کی ترویج کا ذریعہ بھی' لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔

س : ایک زمانے میں آپ ترنم سے پڑھا کرتے تھے' پھر ترنم چھوڑ دیا ایسا کیوں کیا؟

ج : میری مقبولیت پر ترنم کا الزام لگ رہا تھا۔ اس لئے میں نے ترنم ترک کر دیا اور اپنے نکتہ چینوں کو خالص شاعری سے مطمئن کرنا شروع کر دیا۔

س: آپ کو کن کن نامور شخصیات سے ملنے کا اتفاق ہوا؟

ج : حضرت قائد اعظم مہاتما گاندھی' چو این لائی' رضا شاہ پہلوی' آقائے خامنہ ای ثانی سر فہرست ہیں۔ ان سے کم نامور لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

س : آپ کا شمار ایسے منفرد شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے خالصتاً" شاعری ہی سے رزق کمایا اور ماشاء اللہ خوب کمایا۔ کیا موجودہ دور میں ہر شاعر کے لئے ایسا ممکن ہے؟

ج : ہر شاعر کے لئے تو ممکن نہیں' لیکن کوئی شاعر اگر تہیہ کر لے اور ابتدائی فقر و فاقہ کی پروا نہ کرے تو وہ ادب کو ذریعہء معاش بنا سکتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جو کٹھن مراحل طے کئے ہیں' وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں تو آج بھی رات دو دو تین تین بجے تک لکھنے کی ٹیبل پر جھکا پایا جاتا ہوں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ہاتھ پھیلانے والے شعراء کی جگہ اوروں کے دامن میں کچھ ڈالنے والا شاعر بنایا ہے۔ میں نہ تو کسی سرکاری ادارے سے کوئی وظیفہ حاصل کرتا ہوں اور نہ ہی آئندہ اس شرمندگی کا خواہاں ہوں۔ جب تک ہاتھوں میں قلم تھامنے کی سکت ہے اپنے قلم کو تیشہ بنا کر ادب کے بے ستون سے دودھ کی نہر نکالتے رہنے کا آرزو مند ہوں۔

س : آپ کن لوگوں سے محبت کرتے ہیں؟

ج : جو بنی نوع انسان کے لئے فلاحی کاموں میں حصہ لیں۔ جیسے سرگنگا رام' دیال سنگھ کالج کے بانی سردار بہادر دیال سنگھ اور میاں منشی خان۔۔ جنہوں نے انسانوں کی بھلائی کے لئے کالج اور ہسپتال قائم کئے۔ اور صدقہ جاریہ کی لازوال مثالیں پیش کیں۔

س : اور کن سے نفرت؟

ج : لاؤڈ سپیکر کا ناجائز استعمال کرنے والوں سے!

س: کیا ہمارے ناقدین تخلیقات کی پرکھ دیانت داری سے کرتے ہیں؟

ج: یقیناً" کرتے ہیں۔ اپنے اپنے گروہ کی حد تک!

س: موجودہ عہد میں آپ پی آر کے قائل ہیں؟

ج: قائل ہوں لیکن اس کا اہل نہیں!

س: آپ کا تعلق کس ادبی گروہ سے ہے اور کیوں"

ج: ذہنی طور پر اس ادبی گروہ سے جو ابھی تک معرض وجود میں نہیں آیا جسمانی طور پر کسی ادبی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔

س: ادبی اور فلمی اعزازات؟

ج: آدم جی ادبی پرائز "مطربہ" پر اباسین سرحد کے دو ادبی انعامات "آموختہ" اور "پیراہن" پر حاصل کئے اور مختلف فلموں کی بہترین نغمہ نگاری پر اٹھارہ ایوارڈ اور گولڈ میڈل بھی حاصل، کر چکا ہوں۔ گزشتہ برس نیشنل فلم ایوارڈ بھی مجھے حاصل ہوا۔

س: آپ اپنے قارئین کو کیا پیغام دینا پسند کریں گے؟

ج: پیغام دینا تو قومی رہنماؤں کا مشغلہ ہے۔ میں تو اول و آخر ایک شاعر ہوں۔ آپ میرا یہ شعر اپنے قارئین تک پہنچا دیجئے۔:

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں

پرچھائیوں کی انجمن آرائی دے گیا
کتنی عجیب وہ مجھے تنہائی دے گیا

ایک ایک پل میں بیت رہی ہے ہزار عمر
صدیوں کا انتظار وہ ہرجائی دے گیا

وہ کتنا ہوش مند تھا جو میرے نام سے
مشہور خود ہوا مجھے رسوائی دے گیا

میرا کیا علاج محبت کے زہر سے
قاتل مجھے فریب مسیحائی دے گیا

چہرے اب اصل روپ میں آئیں نظر قتیلؔ
آنکھیں چرا کے وہ مجھے بینائی دے گیا

دھوپ ہے' رنگ ہے یا صدا ہے
رات کی بند مٹھی میں کیا ہے

چھپ گیا جب سے وہ پھول چہرہ
شہر کا شہر مرجھا گیا ہے

کس نے دی یہ درِدل پہ دستک
خود بخود گھر مرا بج رہا ہے

پوچھتا ہے وہ اپنے بدن سے
چاند کھڑکی میں کیوں جھانکتا ہے

کیوں برا میں کہوں دوسروں کو
وہ تو مجھ کو بھی اچھا لگا ہے

قحط بستی میں ہے نغمگی کا
مور جنگل میں جھنکارتا ہے

وہ جو گم صم سا اک شخص ہے نا
آس کے کرب میں مبتلا ہے

اپنے لبوں کو دشمن اظہار مت بنا
سچے ہیں جو انہی کو گنہ گار مت بنا

دل کو دبا دبا کے نہ رکھ دھڑکنوں تلے
بے چینیوں کے لطف کو آزار مت بنا

جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گلاب ہیں
لہجے کے فرق سے انہیں تلوار مت بنا

ترک وفا کا جرم نہ مانے گا تو نہ میں
اس مسئلے کو باعث تکرار مت بنا

الزام کچھ تو گردش ایام کو بھی دے
اپنے ہر ایک غم کو غم یار مت بنا

آ میرے بازوؤں میں کہ ساحل پہ جا لگیں
اس موجِ موجِ وقت کو منجدھار مت بنا

یہ تیرا ضبط، اور وہ شعلہ سا آدمی
سورج کے آگے موم کی دیوار مت بنا

شاید وہ تیرے منہ پہ ہی سچ بولنے لگے
چہرے کو آئینے کا پرستار مت بنا

ہر ایک کے لیے نہ کھلا رکھ اسے قتیلؔ
یہ دل ہے ایک گھر اسے بازار مت بنا

گرمئی حسرت ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں

خود نمائی تو نہیں شیوہ ارباب وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

بچ نکلتے ہیں اگر آتش سیال سے ہم
شعلہ عارض گلفام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

کس کو خبر تھی سانولے بادل بن برسے اڑ جاتے ہیں
ساون آیا لیکن اپنی قسمت میں برسات نہیں

ٹوٹ گیا جب دل تو پھر یہ سانس کا نغمہ کیا معنی
گونج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بارات نہیں

غم کے اندھیارے میں تجھ کو اپنا ساتھی کیوں سمجھوں
تو پھر تو ہے' میرا سایا بھی میرے ساتھ نہیں

مانا جیون میں عورت اک بار محبت کرتی ہے
لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے کیا تو عورت ذات نہیں

ختم ہوا مرا افسانہ اب یہ آنسو پونچھ بھی لو
جس میں کوئی تارا چمکے آج کی رات وہ رات نہیں

میرے غمگین ہونے پر احباب ہیں یوں حیران قتیل
جیسے میں پتھر ہوں میرے سینے میں جذبات نہیں

(قتیل شفائی کی نذر)

حرف اترتے ہیں وحی کی صورت
اس پہ نغمات کا آہنگ لیے

اس کی آنکھوں میں بجے رہتے ہیں
خواب تعبیر کے سو رنگ لیے

کہکشاں فن کی سجانے کے لیے
اس نے فطرت کے سبھی رنگ لیے

کائنات اس کا وطن ٹھہرا ہے
اسے پھرتی ہے ہوا سنگ لیے

سر میدان سخن ہے موجود
بات کہنے کے نئے ڈھنگ لیے

ایک ہو کہ بھی نہیں ہے وہ ایک
وہ تو پھرتا ہے کئی رنگ لیے

ناصر بشیر

پروفیسر عتیق احمد

قتیل شفائی کی شاعری کے چند بنیادی عناصر

• درخت اگر سرسبز اور گھنیرے ہوں، اور لق و دق صحراؤں میں ہوں، تو ان کے سایوں کی راحت بخش ٹھنڈک کڑے کوس اور کڑی دھوپ کے مسافروں کو راہ کاٹنا سہل بنا دیتی ہے۔ خواجہ آتش نے ایسے ہی کسی تخیل اور جذبے کے زیر اثر بے ساختہ اور معصوم سی دعا دی تھی۔

خدا دراز کرے عمر ان درختوں کی
کہ جن کے سائے بڑی شے ہیں رہروؤں کے لئے

ادب اور شعر، فنون لطیفہ اور فلسفہ اپنی اصلیت میں جذبات، خیالات اور غور و فکر کے ایسے ہی زندگی بخش اور دل فریب ہریالی کے تختے اور چھتنار درخت ہیں۔ معاشرے کے اندر استحصالی قوتوں کے پیدا کردہ اجاڑ اور لق و دق صحراؤں میں غربت اور افلاس زدہ آبادیوں میں، درد اور کرب کے گونجتے سناٹوں میں، ان کی راحت بخش ہریالی اور ٹھنڈے سایوں کی چھتریاں زندگی سے موت تک کے پرخار راستوں کے مسافروں کی منزلیں آسان بناتی ہیں۔ ان میں جینے کا حوصلہ، آگے بڑھنے کی امنگ اور مقاومت کا جذبہ ہرا بھرا رکھتی ہیں۔ تاریخ انسانیت کے ہر ورق پر ان مسافران آبلہ پا کے چھالوں اور زخمی تلوؤں سے بہتے ہوئے خون کی سرخی ان کی کٹھنائیوں کی گواہی

دیتی رہی ہے۔ ہر دور کے صاحب بصیرت ادیب' شاعر فن کار اور فلسفی نے ان گواہیوں کو ریکارڈ کیا ہے۔ معاشروں کو متحرک اور رواں دواں رکھنے والی اقدار و روایات کی نمو اور آبیاری ان ہی کے "جنوں کی حکایات خوں چکاں" کو ریکارڈ کرنے والے قلموں اور موء قلم کی رہین منت رہی ہے۔

قتیل شفائی اپنی افتاد طبع' مزاج کی ساخت اور فکر کے اعتبار سے اس ہی قافلہ جنون اور لگن کا فرد ہے جو بے آب و گیاہ زمینوں پر خنک سایہ دار اشجار کی پود لگاتا ہوا چلتا ہے' چاہے اس سفر میں اسے جسم و جان کی کیسی ہی کڑی بازی کیوں نہ لگانی پڑی ہو۔ قتیل شفائی کی اس قافلہ جنوں میں یہ شرکت محض لفظی یا جذباتی نہیں ہے' وہ جانتا ہے کہ "حالات" کے بطن سے خود اس کا رد اور مداوا جنم لیتا ہے۔ تب ہی تو وہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ اعلان کرتا ہے: مارے گا شبخون کبھی تو اندھیاروں پر اجیارا" یہ جذبہ یہ لگن "برائے شعر گفتن" نہیں بلکہ اس کے آدرش اور لائحہ عمل دونوں ہی کی بنیاد اور روح ہے قتیل شفائی کی بے چینی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مارے گا شبخون کبھی تو اندھیاروں پر اجیارا
بول مغنی کب گونجے گا آخر شب کا نقارا

قتیل شفائی کے اب تک کے پورے تیس پینتیس برسوں کے شاعرانہ کیریئر پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہو گا کہ آغاز سفر میں اس نے جس کونپل اور نرم و نازک "ہریالی" کی پنیری کو ہمارے ثقافتی اور جذباتی اجاڑ بیابان میں لگایا تھا' وہ موسموں کے گرم و سرد کو سہہ کر اب "چھتنار" درختوں کا ایک ایسا حسین نخلستان بن چکی ہے جس کے دھوپ اور سایہ کے بنت دار CHEQUEREDSHADE میں غزل کی نرمی اور حلاوت' گیتوں کی مدھر اور رس بھری کو ملتا' نظموں کے فکرو فلسفہ کی انقلاب آموز اور زندگی بخش کیفیتیں ہر جگہ گھلی ملی تپتی دھوپ اور کڑے کوس کے مسافروں کو ٹھنڈک اور اگلے سفر کے لئے قوت اور حرارت بہم پہنچا رہی ہیں:

لیکن اب حالات کی نبضوں پہ میرا ہاتھ ہے

ہر قدم پہ آج تیری بھوک میرے ساتھ ہے

اب جو اپنے فن کو مستقبل پہ لہراؤں گا میں

ان گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

قتیل شفائی کے ان اشعار میں جہاں دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کو حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دینے کی امنگ ملتی ہے' وہیں یہ بات بھی بہت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس کا یہ انداز واعظانہ نہیں' بلکہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا' ان کی غم خواری کا اور ان کے ہم سفر ہو جانے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انداز صرف شاعرانہ انداز نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں اور ان کی وساطت سے دوسرے بے شمار افراد کو اپنے ہم راہ لے کر چلنے کا ایک رویہ بن جاتا ہے۔ قتیل شفائی کو اس کے بہت سے ہم عمر اور ہم عصر شعراء میں اس رویہ کی بنا پر الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

قتیل شفائی کی شاعری ان کے جذباتی اور فکری سفر کی ایسی داستان ہے جس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کے درمیان کہیں حد فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی کچھ ان کا قاری اور ان کے معاشرے کا ہر فرد کہنے کا متمنی نظر آتا ہے۔ ان کی ایک نظم "نئی تقویم" کا آخری بند ہے۔

یہ نو عمر پل ' یہ جواں سال گھڑیاں

یہ بوڑھے پہر حسب دستور ہوں گے

عناں وقت کی اپنے ہاتھوں میں ہو گی

ہم اپنے تہور پہ مغرور ہوں گے

وہی ضابطے ہوں گے تقویم کے اب

جو اس دور میں ہم کو منظور ہوں گے

یہی کچھ آج کے منظم ہوتے ہوئے محنت کش معاشروں کی آرزو اور امنگ بھی ہے' لیکن آرزوئیں اور امنگیں تو ہر انسان کی اتنی ہوتی ہیں کہ "ہر خواہش پہ دم

نکلے۔" اصل بات ان کے پس پردہ وہ ولولہ اور یقین ہوتا ہے جو اپنی بات منوانے کے لئے سب کچھ کر گزرنے کی سکت رکھتا ہو۔ قتیل شفائی کے رویے میں یہ یقین اور ولولہ اجتماعیت کے تاریخی شعور کا نتیجہ ہے۔ ان کے (تاحال) موجودہ مجموعے "چھتنار" میں آخر شب کا نقارہ اور "ویٹ نام" دونوں نظمیں اس ہی یقین اور ولولہ کی تاریخ تاویل اور شعور کا واضح ثبوت ہیں۔

ادب اور شاعری کے حوالے سے اسی طرح کی باتیں ہمارے ادب میں "پردہ نشیں بیبیوں" کی قسم کے مبصروں (بزعم خود نقادوں) کو بڑے اچنبھے کی باتیں لگتی ہیں۔ ان کے گھسے ہوئے گراموفون ریکارڈوں پر سوئی برس ہا برس سے صرف اس لکیر میں اٹک کر رہ گئی ہے' جہاں "ادب کو ادب ہونا چاہئے" کا جملہ ریکارڈ ہو گیا تھا۔ اب نہ ساؤنڈ بوکس کی سوئی آگے چلتی ہے' نہ ان مبصران کرام کا ذہن اور قلم آگے بڑھنے کی راہ پاتا ہے۔ قتیل شفائی کی جن نظموں کو ایسے مبصروں نے سب سے زیادہ سراہا ہے وہ "چھتنار" کی دو نظمیں' رخصتی اور غم دل کی وادیوں میں' ہیں۔ وجہ یہ ہوئی کہ یہ دونوں نظمیں اپنی ظاہری طرز ادا کی بنا پر روایتی انداز کی ہیں اور "ان" کے نزدیک نہایت "گھریلو" اور "بے ضرر" قرار پا گئی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں نظموں کا تعلق کسی طور بھی اس مجموعے کی دوسری "غیر روایتی" نظموں سے نہیں جُڑتا۔ ان دونوں نظموں کے بین السطور جو یاس انگیز فضا اور غم آگیں محرومی اور کسک ہے وہ تمام تر بے ضرر طرز اظہار کے باوجود' زندگی بسر کرنے کے پُرعزم ولولوں سے خالی نہیں۔ قتیل شفائی نے اس کیفیت کا اپنے ایک شعر میں بڑی "نزاکت" کے ساتھ اظہار کیا ہے:

تمہاری انجمن کے ہم وہی بجھے چراغ ہیں
جو تیرگی کو اور بھی نکھارتے چلے گئے

قابل تعریف بات تو ان مبصروں کے نزدیک اس شعر میں "رچاؤ" "گھلاوٹ" یا زیادہ سے زیادہ "لہجہ کی کھنک" ایسی دو چار کلاسیکی انداز کی خوبیاں ہی ہوں گی' لیکن قابل غور باتیں تو ہمیں تلخ اوقات والے بندۂ مزدور کی ان بستیوں تک لے جاتی ہیں

جہاں کی تنگ و تاریک فضا کسی اور جگمگاتی جاگتی بستی کے لئے زندگی کا تازہ اور سرخ لہو دے کر تیرگی کی سیاہ چادر میں لپٹی پڑی ہے۔

نظر کی نغمگی، زلفوں کے بل، ہونٹوں کی شیرینی
یہاں ہر چیز جھوٹے پیار پہ مجبور ہوتی ہے
یہاں کردار کے اجلے صنم ڈھالے نہیں جاتے
یہاں ہر زندگی گفتار پہ مجبور ہوتی ہے
جھروکے سے مہکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے فاقے
یہاں چلتا ہے سودا زندگی کی التجاؤں کا
یہاں دن کو بدن تلتے ہیں میزان حکومت میں
یہاں جمتا ہے راتوں کو اکھاڑا رہنماؤں کا
خریدارو یہاں ہر رات جشن عام ہوتا ہے
یہ وہ منڈی ہے جس میں پیار کا نیلام ہوتا ہے

یہ ان بستیوں کی تصویر ہے جس میں ضمیر فروشی، جسم و جان فروشی اور مذہب اور ایمان فروشی، سب کچھ نام و نمود کمانے اور ملمع کی گئی زندگیاں گزارنے کی خاطر روا ہے۔ ستم یہ ہے کہ عیش و عشرت کا یہ "جشن عام" ان محنت کشوں کے استحصال پر بپا کیا جاتا ہے جن کی تنگ و تاریک بستیوں میں فاقوں، بیماریوں اور عسرت کے سوا اور کوئی سرمایہء حیات نہیں ہوتا۔ اس دل دوز صورت حال کو قتیل شفائی نے روح اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:

تو نے مزدوروں کی محنت کے تحفظ کیلئے
شہر یاروں کی رعونت کو ملایا خاک میں
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
کچھ نہیں ہے مفلسوں کے دامن صد چاک میں

قتیل شفائی کے یہاں گرد و پیش کی پیچیدہ اور مضمحل فضا کا یہ شعور بہت فراواں ہے۔ موضوعات کا جتنا تنوع ہمیں ان کے یہاں ملتا ہے وہ سب اس ہی زندہ احساس' کے سبب ہے جو قتیل کو کسی آبلہ پا مسافر کی مانند معاشرے کے ہر گلی کوچہ' ہر بستی اور "جاگتے جگمگاتے" محلات کے تاریک گوشوں تک یوں پہنچا دیتا ہے کہ گویا وہ "اس سب کچھ کا' لنکا بھیدی ہے۔ قتیل کی اداشناس' نظروں سے نہ وہ محنت کش او جھل ہے جس کی نظروں کی چمک اور بازوؤں کی لچک میں انقلاب آفریں طوفان خیزی وقتی طور پر سکوت اور سکون کی دبیز چادر اوڑھے زندگی کی کٹھن راہوں پہ صبرو تحمل کے ساتھ گامزن ہے' اور نہ ہی وہ طبقہ اپنا اصل کردار قتیل کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکتا ہے۔ جو بگلا بھگت بنا ان محنت کشوں کی محنت ہڑپ کرنے کے لئے نت نئے روپ دھارتا ہے اور معاشرہ پر اپنی قیادت اور سیادت کا سکہ چلاتا رہتا ہے۔

قتیل کے فن میں ایک ہمہ جہت درد مندی اور دل سوزی کا عنصر بہت حاوی ہے۔ یہ بات اس ہی فنکار کے یہاں ہوتی ہے جو بے ریا خلوص اور سچ گوئی کی کٹھن راہ کو اپنا سکتا ہو۔ قتیل شفائی نے ان دونوں عادتوں کو اپنی فنی زندگی کا شعار بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سماجی شعور' فنی اظہار اور فکر و تفکر میں کھرا پن' گہرائی اور ہمہ گیری کا حسین امتزاج ملتا ہے' ذرا ان اشعار کو دیکھئے کہ اس میں قتیل کا چہرہ اور کردار کس طور ابھرتا ہے۔

جب اپنے اعتماد کے محور سے ہٹ گیا
میں ریزہ ریزہ ہو کے حریفوں میں بٹ گیا

لٹتے ہوئے عوام کے گھر بار دیکھ کر
اے شہر یار تیرا کلیجہ نہ پھٹ گیا

چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیل
جو ہاتھ بے قصور تھا وہ ہاتھ کٹ گیا

جو بیت گئی اس کی خبر ہے ' کہ نہیں ہے

میرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمت انساں کی آنچ آتی ہے
میرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا
کہ اکثراس سے مشیت شکست کھاتی ہے
میں خود اسیر سہی، میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

قتیل شفائی کے اس اعلان کا پس منظر بھی سن لیجئے، جو اس ہی نظم کے پہلے اور دوسرے بند کے دو اشعار میں ملتا ہے:۔

میرے قلم سے تقاضہ ہے شہر یاروں کا
کہ اسکے لب پہ رہے تذکرہ بہاروں کا
یہ بھولا بھالا تقاضہ بجا سہی لیکن
میرے ضمیر کو یہ بندگی قبول نہیں

قتیل شفائی کے یہاں یہ جذبہ پوری استقامت کے ساتھ گزشتہ تیس برس کی شاعری میں ملتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کے نوجوانی کے مزاج میں عشق و رومان پسندی (پرستی نہیں) کچھ حائل ضرور رہی، مگر جلد ہی وہ اس فضا سے اپنے آپ کو نکال لایا۔ بالخصوص "روزن" اور اس کے بعد کی شاعری میں قتیل کی ابتدائی شاعرانہ روش سے بتدریج گریز واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے، اور "چھتنار" تک پہنچتے پہنچتے یہ جذبہ قتیل کے فکر وفن کا لازمہ بن گیا۔

ابلاغ کو ہماری جدیدیت پسند نسل نے ایک مسئلہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مرکزی کردار یہی رہا ہے کہ اس نے ابلاغ کو ابہام پسندی اور لا یعنی الفاظ کے گورکھ دھندے سے نکال کر عام فہمی بلکہ عوام فہمی کی راہ دکھائی۔ رجعت پرستوں نے اس پر بہت ناک بھوں چڑھائی، بلکہ ابھی تک ادب میں صحافتی انداز رائج کرنے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ جدیدیت پسند نسل نے ترقی پسند تحریک سے انحراف اور بغاوت کا گر

گرہ میں باندھا اور سب سے پہلا وار سیدھے اور صاف ستھرے طرز اظہار پر ہی کیا۔ نتیجہ سامنے ہے۔ حد اور انتہا یہ ہے کہ علامات جیسی نازک چیز کو بھی انہوں نے گنجلک اور ثقیل بنا کر نا قابل فہم بنا دیا۔ ابلاغ کا اصل معاملہ یہ ہے کہ اگر گفتگو کرنے یا لکھنے والا اپنے خیال اور جذبہ کو پوری طرح سے سمجھتا ہے تو نہ بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو گی نہ لکھنے میں کہیں بے جا تاویلات اور مبہم الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت پڑے گی۔ بات یہ نہیں ہے کہ علامتی شعر اور علامتی نثر کوئی عیب یا گھٹیا بات ہے مگر بات یہ بھی تو نہیں ہے کہ مروجہ غیر علامتی اسلوب اور اظہار کوئی عیب یا گھٹیا پن ہے۔

ساری بات اتنی ہے کہ کہنے اور لکھنے والا جو کچھ کہہ اور لکھ رہا ہے' اس میں کہیں گوشت پوست کا آدمی بولتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ آواز کہیں غیر مرئی یا مافوق البشری آواز تو نہیں بن رہی ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ فرشتوں کے لئے لکھنا ہے تو پہلے ان کی زبان اور بولی سیکھئے۔ اور اگر آدمیوں اور انسانوں کے لئے لکھنا ہے تو ان کی زبان اور ان کی بولی نہ بھولئے۔ رہ گئی بات' ہر بات میں فلسفہ بھگارنے کی تو یقین کیجئے کہ فلسفہ اتنا آسان نہیں ہے کہ مونگ یا مسور کی دال میں بھی اس کا بگھار لگایا جا سکتا ہو۔

قتیل شفائی کے اسلوب اور اظہار میں ایک روانی ایک شگفتگی اور ایک بہاؤ ہے۔ ابلاغ اس کے یہاں مسئلہ نہیں ایک فریضہ ہے۔ فرض کی ادائیگی کو مسئلہ بنا دینا' نا اہلی کے ٹریبونل کے سامنے پیشی لگوانا ہے۔ قتیل شفائی نے زبان و بیان کی پر پیچ راہوں کو اس ہی لئے ہموار پگڈنڈی بنائے رکھا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے' کس نے کہنا ہے' اور کس کی طرف سے کہنا ہے۔ قتیل کے ان اشعار کو پڑھیے:

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک
جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے
جس میں غلے کے نگہباں ہیں وہ گیدڑ جن سے
قحط و افلاس کے بھوتوں نے اماں چاہی ہے

زندگی بھوک مٹائے کہ ہوا سے کھیلے
مطمئن پیٹ نہیں ہے تو وفا کیسی ہے

برہنہ جسم کو تلقین حیا کیا معنی!
سانس رک جائے تو پھر موج ہوا کیسی ہے

کیا یہاں قتیل نے رمزو اشاریت کے گروں کو نہیں برتا؟ کیا ان اشعار میں کہیں کوئی علامت نہیں استعمال ہوئی ہے؟ کیا ان اشعار کے پیچھے جذبے اور جذبات میں گہرائی کا احساس نہیں ہوتا؟ کیا شاعر کے لہجے میں کوئی اتھلا پن ہے؟ زمانہ سازی ہے؟ یا یہ سب محض سخن سازی ہے؟ کیا وہ بات ان تک نہیں پہنچ رہی ہے جن سے کہی گئی ہے؟ یا وہ سمجھنے سے قاصر رہ جائیں گے کہ جن کی نیابت کی گئی ہے؟ شعرو ادب کی کسوٹی تو ان ہی سوالات کے مرکب سے تیار کی جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی سوال ایسا نہیں ہے کہ جس کا مطلوبہ اور صحیح جواب نقد ادب و شعر کی اس کسوٹی پر منفی رویہ پیش کرے۔

قتیل شفائی اپنے شعری مواد رویے' اسلوب اور اظہار میں ہر اعتبار سے سچا فن کار اور کھرا ترقی پسند ہے۔ اس کے احساس کی تپش اور ادراک کی صلابت دونوں ہی اس کے سچے اور کھرے پن کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ ملمع ساز نہیں ملمع سازوں کے اصلی چہروں کی درندگی اور شقاوت کو بے نقاب کرنے والا فنکار ہے:

آج کہ ہیں نودو تیوں کے پانچ سواروں میں شامل
چودھری صاحب "سوشل ازم" کے سخت مخالف ہیں
اور پانچوں وقت مصلے پہ لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں

قتیل شفائی کے اس انداز میں اس کی فنکارانہ صداقت پر کسی علامت یا سمبل کا پردہ نہیں ہے۔ اس نے جو دیکھا جو سوچا بس وہی لکھ دیا۔ دیکھنے سوچنے اور لکھ دینے کا مرحلہ بہت کٹھن ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان تینوں مراحل میں لکھنے والوں کا شعور

تاریخ نہ صرف بیدار ہو بلکہ تاریخ عصر اس کے دائرۂ فکر سے باہر کی بات بھی نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قتیل کے یہاں یہ دونوں ہی عناصر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ کبھی اس کے جذبے کی آنچ دھیمی پڑی ہے اور نہ کبھی اس کے فکر و نظر کے چراغ کی لو مدھم ہوئی ہے۔ پچیس تیس برس کی مدت بہت لمبی تو نہیں لمبی ضرور شمار ہوتی ہے۔ اس عرصے میں قتیل کے کتنے ہی ہم سفر فنکار یا تو عہدوں اور جاہ پسندی کی سودا بازیوں کی نذر ہو گئے یا پھر ترقی پسند تحریک پر قدغن اور اس تحریک سے وابستہ ادیبوں پر حصول معاش کی تنگی اور اظہار و بیان پر پہرہ بٹھا دیئے جانے کے عمل سے گھبرا کر جنت کمانے نکل کھڑے ہوئے۔ قتیل نے اس لمبی مدت میں اپنے احساس، شعور، دیدو آگہی کی روش اور قلم کی جنبش "مستانہ" کو مردانہ وار باقی اور برقرار رکھا۔ اس نے قلم اور کاغذ، دونوں کی حرمت کیلئے جوش اور جذبے کے ساتھ جنگ جاری رکھی۔ یہ نہیں ہے کہ اذیتوں سے اس کا واسطہ نہ پڑا ہو، مگر اس نے نہ کبھی اس کا مرثیہ لکھا نہ صورت حالات پر بین کیے۔

اب کہ قتیل شفائی کو قلم اور قرطاس سے رشتہ جوڑے کوئی "نصف صدی کا قصہ ہو رہا ہے" اس کے پڑھنے والوں کو اس بات پر بہت خوشی اور اطمینان ہے کہ قتیل کے لب و لہجہ میں، اس کے انداز فکر میں، اور اس کی رفتار نگارش میں استقامت، پختگی اور ایک ارتقائی عمل مسلسل جاری رہا ہے۔ کشاکش زندگی اور صعوبتوں سے مسلسل دو چار رہنے کے باوجود ان کا یہ فن کار ہر بار نئے حوصلوں اور نئے ولولوں کے ساتھ ان کے دوش بدوش اور ہم سفر رہتا ہے۔ قتیل شفائی کی اس روش نے اس کے فکر و فن کو ہر موڑ پر اور ہر لمحہ متحرک رکھا ہے۔ اس کے لفظوں کو شگفتگی اور اس کے ارادوں کو تازگی دی ہے۔ وہ کھلے دل و دماغ کا فنکار ہے اور یہی سب کچھ کسی بھی فنکار کے فن کو سدا بہار اور خود فن کار کو زندہ جاوید بنانے کی ضمانت دیتا ہے۔

اس کے بے شمار قارئین کے اس اعتماد میں شریک ہوتے ہوئے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ قتیل شفائی اپنے پڑھنے والوں اور ملک کے

کچلے اور دبے ہوئے عوام کے لئے استحصال سے پاک اور پر مسرت مستقبل کی تعمیر میں اس ہی طرح سے اپنے قلم کو وقف پیکار رکھے گا۔ وہ جس طرح آج شاعری کے سچ بولنے کا معترف ہے، آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا کہ ہمیں اس کے لکھے ہوئے لفظوں پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔

زخمی کانپوری

مقبول شاعر قتیل شفائی

کسی شاعر کی غزل کا ایک مصرع یا گیت کا ایک مکھڑا لوگوں کی زبان پر آ جائے یا دل میں اتر جائے تو یہ شاعر کی معراج ہوتی ہے اور شاعر زندگی بھر اس بات کیلئے تڑپتا رہتا ہے مگر جہاں سینکڑوں اشعار کسی شاعر کے لوگوں کو یاد ہوں اور پسند ہوں تو اس شاعر کے لیے کیا کہا جائیگا؟ قتیل شفائی ہمارے برصغیر کے ایسے ہی شاعر ہیں جن کی متعدد فلمی غزلیں اور گیت لوگوں کو ازبر یاد ہیں۔ غزل شاعر کے دیوان میں ہو یا فلم کے پردے پر ہر جگہ معتبر ہوتی ہے۔

بمبئی اور لاہور کے فلمی مراکز میں متعدد شعراء نے قدم جمانے کی کوشش کی مگر ان میں کامیاب چند ہی ہوئے ان میں ایک نام قتیل شفائی کا بھی ہے قتیل شفائی پاکستان کے واحد شاعر ہیں جن کی جتنی عزت ادب میں کی جاتی ہے اتنی ہی عزت فلمی دنیا میں کی جاتی ہے ان کے تحریر کردہ فلمی گیت جتنے پاکستان میں مقبول ہوئے اتنے ہی انڈیا میں پسند کئے گئے ان کی فلمی شاعری کا بھی وہی معیار ہے جو ادبی شاعری کا ہے شاید ہی کوئی مصرع آپ کو فلمی غزل کا معیار سے گرا ہوا ملے۔ یہی حال گیت کا ہے ان کے ادبی گیت بھی لوگوں نے فلموں میں استعمال کئے جیسے فلم دامن اور چنگاری میں مرحوم شباب کیرانوی نے اپنی فلم میں ان کا یہ گیت تخلیق کرنے کے تقریباً پاؤ

صدی کے بعد استعمال کیا۔ "سہیلی تیرا با نکپن لٹ گیا، آئینہ توڑ دے" یہی گیت 1960ء کی دہائی میں کراچی ریڈیو کے مشہور گلو کار ایم کلیم نے بھی گایا تھا جو اس دور میں سننے والوں میں بے حد پسند کیا گیا تھا مگر صحیح معنوں میں اس گیت کو مقبولیت ملکہ ترنم نور جہاں کے گانے کے بعد ملی۔ اس طرح قتیل صاحب کا ایک اور ادبی گیت تقریباً اتنے ہی عرصے کے بعد فلم ناز میں استعمال کیا گیا۔ جو مالا نے اپنی مدھر آواز میں گایا تھا۔ اس کی دھن ماسٹر عنایت حسین مرحوم نے بنائی تھی۔ اس کے بول یہ ہیں۔

میں اتنے زور سے ناچی آج کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے۔

ایک زمانے کے بعد اسی گیت کو اسی دھن کیساتھ انڈیا میں بھی کسی فلم میں استعمال کیا گیا۔ یہ اس گیت کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ گویا گیت ہو یا غزل ادبی شاعری ہو یا فلمی شاعری ہر جگہ ان کا نام اور کلام دونوں معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے یہ واحد شاعر ہیں کہ انڈیا کے فلم سازان سے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھوانے کی آرزو کرتے ہیں۔

قتیل شفائی 1919ء میں ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام اورنگ زیب خان ہے۔ ان کے والد گرامی کا نام فیروز خان تھا ابتدائی تعلیم ہری پور کے گورنمنٹ اسکول میں پائی مگر والد کے انتقال کی وجہ سے یہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ ان کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی تو شعر کہنے شروع کئے مگر قتیل تخلص اس کے چھ سال بعد یعنی 1938ء میں رکھا۔ اس وقت تک ان کے کلام میں پختگی آ چکی تھی۔ راولپنڈی کے ایک بزرگ شفا کے شاگرد ہو گئے اس لئے شفائی لکھنا شروع کیا یوں قتیل شفائی ہو گئے۔ اگرچہ تعلیم کا سلسلہ تو ابتدائی عمر ہی میں منقطع ہو چکا تھا۔ مگر اس کمی کو انہوں نے اپنے ذاتی مطالعے سے پورا کیا۔ تقسیم ملک سے قبل ہی آپ لاہور آ گئے۔ یہاں آکر احمد ندیم قاسمی کی صحبت میں رہ کر ان کے کلام نے اور بھی جلا پائی اور اس طرح یہ لاہور کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے اور معیاری ادبی رسائل

میں ان کا کلام پابندی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 1942ء میں شائع ہوا۔ ان باتوں کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ابتداء میں انہوں نے نثر بھی لکھی مگر بعد میں چھوڑ دی اور اپنی تمام تر توجہ صرف شاعری پر مرکوز کر دی۔ برسوں سے پاکستان کے صف اول کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں قتیل شفائی کو پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے کئی شہروں میں مشاعروں میں شرکت کی ہے اور خوب داد سمیٹی۔ آپ مشاعرے کے بھی کامیاب شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں آج بھی کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مکمل تصور نہیں کیا جاتا۔

لاہور میں رہنے کی وجہ سے فلموں میں آنا ایک لازمی امر تھا۔ انہوں نے تقسیم ملک سے قبل ہی لاہور میں بننے والی ایک فلم میں گیت لکھے تھے مگر تقسیم کے باعث وہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔ 1947ء میں جب پاکستان بنا تو انہوں نے پاکستان کی پہلی فلم "تیری یاد" کے گیت تحریر کئے۔ اس وجہ سے یہ سینئر ترین نغمہ نگار ہیں۔ فلم "فلم تیری یاد" فلاپ ہوئی اور ان کے اور گیت بھی مقبول نہ ہو سکے۔ مگر اس کے باوجود ان کو فلمی دنیا میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ ان کا سب سے پہلا مقبول ہونے والا فلمی گیت فلم محبوبہ کا تھا جس کے بول یہ ہیں۔

محبت مسکرائی ہر شے جوانی میں
کسی کا نام شامل ہو گیا میری کہانی میں

یہ فلم 1953ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کی دھن موسیقار ماسٹر عنایت حسین مرحوم نے بنائی تھی جبکہ اس ڈوئیٹ کو منور سلطانہ اور فضل حسین نے گایا تھا۔ فضل حسین نے زیادہ عرصہ تک فلمی دنیا میں گلو کاری نہیں کی۔ اس زمانے کا یہ مقبول ترین گیت تھا۔ ان کی پہلی کاوش تھی جسے سراہا گیا۔ حالانکہ یہ اس وقت تک ایک درجن سے زائد فلموں میں نغمہ نگاری کر چکے تھے۔ اس گیت سے فلمی دنیا میں ان کی

پہچان ہوئی۔ اس کے دو ماہ بعد فلم گلنار ریلیز ہوئی۔اس کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر مرحوم تھے۔ پاکستان میں یہ ان کے کیریئر کی دوسری فلم تھی جس کے گیت سپر ہٹ ہوئے اس سے پہلے ان کی فلم بے قرار کے گیت بہت مقبولیت پا چکے تھے۔ فلم گلنار کے گیت قتیل شفائی کے تحریر کردہ تھے۔ فلم گلنار کے یہ تین گیت اس دور کے مقبول ترین گیت تھے جو فلم گلنار کی ہیروئن نور جہاں نے گائے تھے۔

1- وہ چل دیے ہیں دل کو تسلی دیے بغیر
لو چاند چھپ گیا ہے اجالا کئے بغیر
2- بچپن کی یاد گارو میں تم کو ڈھونڈتی ہوں
تم بھی مجھے پکارو
3- سکھی ری نہیں آئی

فلم "گلنار" کے ریلیز ہونے کے چند دنوں بعد ہی ماسٹر غلام حیدر مرحوم انتقال کر گئے وہ پوری طرح ان گیتوں کی مقبولیت بھی نہ دیکھ سکے نور جہاں نے ایک دفعہ اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ موسیقی کے رموز مجھے ماسٹر غلام حیدر مرحوم نے ہی بتلائے تھے۔ ماسٹر صاحب نے نور جہاں کے علاوہ اپنے لاہور کے قیام کے دوران شمشاد بیگم اور بمبئی کے قیام کے دوران لتا جیسی گلو کارہ سے گیت گوائے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ماسٹر صاحب کی جوہر شناس آنکھیں کس قدر تیز تھیں۔ بہر حال ان تینوں گلوکاراؤں پر ان کا بڑا احسان ہے۔ 1955ء میں قاتل اور نوکر اپنے مقبول گیتوں کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہیں قاتل کے موسیقار بھی ماسٹر عنایت حسین مرحوم تھے اس میں ان کی تحریر کردہ یہ غزل جو اقبال بانو نے گائی تھی بڑی پسند کی گئی۔

الفت کی نئی منزل کو چلا تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں

دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اس کی بازگشت پورے برصغیر میں آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کی دھن بنانے پر بھارت کے بڑے بڑے موسیقاروں نے ماسٹر عنایت حسین مرحوم کو بڑی داد دی تھی۔ اسی غزل کی مقبولیت کے سبب قتیل شفائی صاحب کی پہچان بھارت میں ہوئی اور ان کے مداحوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ فلم نوکر بھارتی فلم اولاد کا چربہ تھی۔ اس کے فلمسازو ہدایت کار عطاءاللہ شاہ ہاشمی تھے۔ یہ اس دور کی کامیاب ترین فلم تھی۔ یوں تو اس فلم کے تمام گیت مقبول ہوئے مگر اس کی لوری بہت مقبول ہوئی تھی اس کی دھن بھی چربہ تھی جو موسیقار جی اے چشتی نے بنائی تھی اس کی لوری کے خالق بھی قتیل صاحب تھے۔ اس کے بول تھے۔"راج دلارے تو ہے دل میں بساؤں" اس کی دھن جی اے چشتی نے بڑی مسحور کن بنائی تھی۔ انڈیا میں اسی دھن پر"میں تو واری واری جاؤں" فلم لوری میں لتا نے گائی تھی۔ مگر وہ مقبول نہ ہو سکی۔ اس لوری کے ساتھ بھی بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ فلم میں یہ لوری منور سلطانہ کی آواز سے لی گئی جبکہ آر پی ایم ریکارڈ میں یہ گیت کوثر پروین کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ جس پر منور سلطانہ نے بڑا شور کیا۔ مگر بعد میں یہ معاملہ دب گیا۔ 1956ء میں فلم لخت جگر، حمیدہ اور انتظار ریلیز ہوئیں ان کے گیت بھی بے حد مقبول ہوئے۔ یہ گیت بھی قتیل شفائی صاحب کے نوک قلم کا نتیجہ تھے۔ حمیدہ کے موسیقار صفدر مرحوم تھے جبکہ انتظار کے موسیقار خواجہ خورشید انور مرحوم تھے۔ پاکستان میں یہ ان کی پہلی فلم تھی اس سے پہلے آپ بمبئی میں قیام پزیر تھے اور کئی مقبول فلموں کی موسیقی دے چکے تھے۔ حمیدہ میں قتیل صاحب کی یہ غزل جو زبیدہ خانم نے گائی تھی بہت ہی لاجواب تھی فلموں میں المیہ سچویشن میں اس سے بہتر غزل مشکل ہی سے ملے گی۔

میرے اشکوں کا نذرانہ دل ناشاد لایا ہے

تیری دنیا نے لوٹا ہے یہی فریاد لایا ہے

ایک اور گیت کوثر پروین کا گایا ہوا جس کے بول یہ تھے "ہر قدم پر ستم ہر گھڑی پر ستم غم سہنا پڑا" بڑا مقبول ہوا تھا۔ فلم حمیدہ میں زبیدہ خانم اور سلیم رضا کی آواز میں یہ ڈوئیٹ بھی اس دور کا مقبول ترین ڈوئیٹ تھا۔

میرا دل دھڑکے میری آنکھ پھڑکے

لخت جگر کے موسیقار بابا چشتی تھے نور جہاں نے انکا یہ گیت اس میں گایا تھا آ حال دیکھ لے میرا کہ دل میں درد چھپا کے تیرا میں برباد ہوئی۔

انتظار کے گیت خواجہ صاحب نے وائلن کی مدھر آواز کو استعمال کرتے ہوئے کمپوز کئے تھے۔ اس فلم میں ان کے یہ گیت

(1) آ بھی جا آ بھی جا دیکھ آ کر ذرا
مجھ پہ گزری ہے کیا تیرے پیار میں
(2) جس دن سے پیا دل لے گئے دکھ دے گئے
اس دن سے گھڑی بل حائے چین نہیں آئے

خواجہ خورشید انور مرحوم کو اس فلم کی موسیقی مرتب کرنے پر صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا جو اسکندر مرزا مرحوم نے اپنے دست مبارک سے ان کو دیا تھا۔ پہلی بار صدارتی ایوارڈ کا اجرا ہوا تھا جو بعد میں جاری نہ رہ سکا۔ اس کی موسیقی کی تعریف شاہ ایران نے بھی کی تھی صدر اسکندر مرزا اپنے ایران کے دورے میں فلم انتظار لے کر گئے تھے اسی طرح صدر ہند ڈاکٹر رادھا کرشن نے بھی تعریف کی تھی کیونکہ یہ فلم اسپیشل طور پر ان کو دکھائی گئی تھی اس کے دیکھنے کے بعد انہوں نے انڈیا کے موسیقاروں کو کہا کہ اس فلم کی موسیقی سے سبق سیکھنا چاہئے۔

1958ء میں فلم عشق لیلیٰ۔ کے گیتوں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ سب گیت سپر

ہٹ تھے۔ اس کو میوزیکل فلم کا درجہ حاصل ہے۔ چند گیتوں کے بول دیکھئے

1- ستارو تم تو سو جاؤ پریشاں رات ساری ہے۔

(اقبال بانو)

2- جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے محبت کا جنازہ جا رہا ہے۔

(عنایت حسین بھٹی)

3- چاند تکے چھپ چھپ کے اونچی کھجور سے۔

(سلیم رضا/زبیدہ خانم)

4- لیلیٰ لیلیٰ لیلیٰ اب تو شدم دور لیلیٰ۔

(زبیدہ خانم)

ان گیتوں کی دھنیں صفدر مرحوم نے بنائی تھیں۔ صفدر مرحوم کے کیریئر کی یہ شاندار فلم تھی۔

انارکلی میں قتیل صاحب کے یہ دو گیت (1) صدا ہوں اپنے پیار کی (2) پہلے تو اپنے دل کی رضا جان جایئے۔
اپنی مقبولیت کے سبب سر فہرست تھے۔

1959ء میں موسیقار صفدر مرحوم کی فلم ناگن ریلیز ہوئی۔ اس میں ان کے لکھے ہوئے یہ گیت پسند کئے گئے۔

1- امبوا کی ڈالیوں پہ جھولنا جھلا جا۔

اقبال بانو

2- سیاں جی کو ڈھونڈنے چلی۔

ناہید نیازی

1963ء سے ایک بار پھر فلمی شاعری کے میدان میں یہ سب سے آگے نظر آئے اس سال ان کی ایک ساتھ تین ایسی فلمیں ریلیز ہوئیں کہ جن کے گیت بڑے پسند کئے گئے فلم عشق پر زور نہیں کے اس گیت نے تو مقبولیت کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے۔

دل دیتا ہے رو رو دہائی کسی سے کوئی پیار نہ کرے۔

اس گیت سے مالا کی شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ گیت قتیل شفائی صاحب کے مقبول ترین گیتوں میں شمار ہوتا ہے دوسری فلموں میں فلم سیما اور اک تیرا سہارا بھی ان کی کامیاب فلمیں تھیں ان فلموں کے موسیقار بھی ماسٹر عنایت حسین تھے۔ فلم اک تیرا سہارا کے یہ گیت۔

1۔ اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں۔
(سلیم رضا/نسیم بیگم)

2۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہے
(نسیم بیگم)

1964ء میں فلم ہیڈ کانسٹیبل شباب' چنگاری' حویلی اور فرنگی ایسی فلمیں تھیں کہ جن کے گیت انہوں نے تحریر کئے۔ فلم شباب کا یہ گیت۔

نگاہیں ملا کر بدل جانے والے
مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے

یہ دنیا بڑی سنگدل ہے یہاں پر
کسی کو کسی سے محبت نہیں ہے

ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں مقبول ہونے والا ایک بے مثال گیت تھا۔

اس کی دھن رشید عطرے مرحوم نے بنائی تھی۔ فلم فرنگی کے موسیقار بھی رشید عطرے مرحوم تھے۔ اس کے گیت بھی بچے بچے کی زبان پر تھے۔ جو مالا نے گائے تھے۔ اس فلم کے ان دو مقبول گیتوں کے بول ملاحظہ فرمایئے۔

1- آ بھی جا دلدارا' آ بھی دلدارا

2- آئے گا اکبر خانا کہہ دوں گی دلبر جانا

فلم فرنگی شمیم آرا اور سدھیر کی اداکاری اور اپنے گیتوں کی وجہ سے ایک لاجواب فلم تھی حویلی اور چنگاری کی موسیقی خواجہ خورشید انور مرحوم نے دی تھی۔ ان دونوں فلموں کے چند گیت بڑے یادگار گیت ہیں جیسے فلم حویلی

1- میرا بچھڑا بلم گھر آ گیا

(نسیم بیگم)

2- "کلی کلی منڈ لائے بھنورا"

(نسیم بیگم)

1965ء میں فلم دیوداس اور نائلہ میں ان کے تحریر کردہ گیت کافی مشہور ہوئے فلم دیوداس کے موسیقار اختر حسین تھے۔ انہوں نے کوثر پروین سے یہ مشہور گیت گوایا تھا۔ چاند سے پیارا مکھڑا مورا گھونگٹ میں شرمایو رے۔

فلم نائلہ کے گیت قتیل صاحب کے کیریئر کے شاندار گیت تھے۔ ان کی دھنیں ماسٹر عنایت حسین نے بنائی تھیں۔ ان کے چند گیتوں کے بول یہ تھے۔

1- مجھے آرزو تھی جس کی وہ پیام آ گیا ہے۔ (مالا)

2- غم دل کو ان آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے۔ (مالا)

3- کوئی پیار کا فسانہ گوری پیا کو سناؤ۔ (مالا)

1966ء میں فلم پائل کی جھنکار ریلیز ہوئی۔ اس میں ان کی تحریر کردہ یہ غزل جو سلیم رضا نے گائی تھی۔ بڑی ہٹ ہوئی۔

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

فلموں میں ایسی غزل دور دور تک نظر نہیں آتی۔ یہ اپنے زمانے کی مقبول ترین غزل شمار ہوتی ہے گویا یہ ادب کا حسین مرقع تھا۔ قتیل صاحب نے یہ غزل فلم میں دینے سے پہلے کئی بار مشاعروں میں پڑھ کر خوب داد سمیٹی تھی۔ بعد میں جب یہ فلم پائل کی جھنکار میں استعمال کی گئی تو اور بھی زیادہ مقبول ہو گئی۔

1968ء میں یہ ایک بار پھر بازی لے گئے۔ اس سال ان کی دو معرکہ الارا' فلمیں ریلیز ہوئیں یعنی جان آرزو اور دل میرا دھڑکن تیری۔ ان دونوں کے موسیقار' ماسٹر عنایت حسین مرحوم تھے۔ فلم جان آرزو کا یہ گیت سلیم رضا کی آواز میں ایک عمدہ گیت تھا۔ "اے جان آرزو" اسی فلم میں مجیب عالم نے یہ گیت گایا تھا۔ "تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے۔" فلم دل میرا دھڑکن تیری ایک نغمہ بار فلم تھی۔ اس کے تمام گیت سپر ہٹ تھے۔ ماسٹر عنایت نے غنائیت سے بھرپور موسیقی دیکر اپنا لوہا منوایا تھا۔ اس فلم کے گیتوں کے بول دیکھیے۔

1- کیا ہے جو پیار تو پڑے گا نبھانا

(احمد رشدی / مالا)

2- جا دیکھ لیا تیرا پیار

(احمد رشدی / مالا)

3- اب تو آ جا کہ تجھے یاد کیا ہے میں نے

(مہدی حسن)

4- جھوم اے دل وہ میرا جان بہار آئے گا

(مسعود رانا)

1969ء میں فلم پاک دامن، سزا اور دل بیتاب کے گیت انہوں نے تحریر کئے۔ یہ دونوں فلمیں اپنے گیتوں کی وجہ سے اپنے دور کی کامیاب فلمیں شمار ہوتی ہیں۔ فلم سزا کے موسیقار ناشاد مرحوم تھے جبکہ دل بیتاب کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین مرحوم تھے۔ فلم بے تاب کا یہ گیت جو مہدی حسن اور نورجہاں نے اپنی اپنی آوازوں میں الگ گایا تھا۔ مقبول ترین گیت تھا۔

ہم سے بدل گیا وہ نگاہیں تو کیا ہوا
زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کئے بغیر

ایک زمانے میں یہ گیت ریڈیو پر کئی بار نشر ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ ریڈیو کا دور تھا۔ فلم سزا میں ان کے گیت اپنی انفرادی حیثیت کے حامل تھے۔ جیسے یہ گیت "جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ" اپنے اندر زمانے کا شکوہ رکھتا ہے جو حقیقت بھی ہے۔ مہدی حسن صاحب نے بھی یہ گیت بڑے ہی خوبصورت انداز میں گایا تھا۔ ناشاد مرحوم کی مسحور کن دھن نے اس گیت میں مزید چار چاند لگا دیئے۔ اسی فلم کا یہ دوسرا گیت جو مالا کی آواز میں ایک خوبصورت ترین گیت تھا۔

میرے جوڑے میں گیندے کا پھول

فلم پاک دامن میں ماسٹر عنایت حسین مرحوم نے ان کی یہ غزل "کیا خبر تھی تیری محفل سے نکلنا ہو گا" نورجہاں سے گوائی تھی۔ 1970ء میں فلم نجمہ اور آنسو بن گئے موتی ایسی فلمیں ریلیز ہوئیں کہ جن کے گیت قتیل شفائی صاحب نے تحریر کئے تھے۔

ان دونوں فلموں کے موسیقار ماسٹر عنایت مرحوم تھے۔ ان فلموں کے یہ گیت مقبول ترین گیت تھے۔ فلم نجمہ

1- چلے ٹھنڈی ہوا تھم تھم

(مالا/ رشدی)

فلم آنسو بن گئے موتی

2- رم جھم برسن لاگی رے پھوار

(نسیم بیگم)

1971ء میں واحد فلم سلام محبت تھی کہ جس کے گیت مقبول ہوئے جو ان کے تحریر کردہ تھے جبکہ موسیقار خواجہ خورشید انور مرحوم تھے۔ مہدی حسن کا گایا ہوا یہ گیت اس قدر پاپولر ہوا تھا کہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے تھے۔

کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جان تمنا
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

قتیل شفائی صاحب نے فلموں میں کئی مقبول نعتیں بھی تحریر کی ہیں۔ جیسے فلم شباب کی یہ نعت "میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے" ان کی ایک نعت فلم فرنگی میں شامل تھی۔

قتیل شفائی صاحب نے کبھی بھی کسی پنجابی فلم میں کوئی گیت تحریر نہ کیا۔ انہوں نے ایک فلم اپنی مادری زبان میں یعنی ہندکو میں بنائی تھی جس کا نام عجب خان تھا مگر یہ بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے فلمسازی سے توبہ کر لی۔

قتیل شفائی ایک ایسے شاعر ہیں کہ روز اول کی طرح آج بھی ان کی فلم اور ادب میں اہمیت اپنی جگہ پر ہے۔ اگرچہ آج کل فلمی شاعری کا ٹرینڈ بدل چکا ہے مگر

انھوں نے اپنی روش کو کبھی نہ بدلا۔ آج بھی اگر یہ فلموں کیلئے گیت لکھتے ہیں تو اپنے
معیار کو برقرار رکھتے ہیں۔

قتیل کے ذہن کی جو خصوصیت میں اس کی تمام تخلیقات میں نمایاں طور پر پہچانتا ہوں وہ یہ ہے کہ حقائق کے جواہر تابناک کے جو پہلو زیادہ تابناکی کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں وہ اس نور کی دھند کو چیر کر حقیقت کو دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا اسلوب نظر ہمیشہ منفرد ہوتا ہے۔ انداز فکر ہمیشہ یکتا اور عمق و تاثر بے نظیر

سید عابد علی عابد

قتیل شفائی کی شاعری میں فنی اعتبار سے جدت پسندی کے باوجود روایت کا خون گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس وجہ سے اس میں رنگینی اور پرکاری کے ساتھ وہ توانائی نظر آتی ہے جو حسن وشباب کے امتزاج سے مناسبت و مشابہت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

قتیل عوامی شاعر ہے۔ عوام کی زبان میں لکھتا ہے۔ اس کے یہاں حسن و عشق کی وارداتوں کو ایک موثر کن پیرایہ اظہار مل گیا ہے۔

محمد علی صدیقی

قتیل شفائی ان لکھنے والوں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کو زندگی بنایا ہے۔ اس باب میں ان کا ثبات قابل داد ہے

ابن انشا

نظم ہو یا غزل ہو یا گیت ان تینوں اصناف میں سے کوئی قتیل شفائی کے دست قدرت سے باہر نہیں۔ گیت کو انھوں نے وہ آبرو بخشی کہ یہ ایک مستقل ادبی صنف شمار ہونے لگی۔

شان الحق حقی

اس دور کے جن بہت کم شاعروں کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی ہے ان میں قتیل شفائی کا نام قابل رشک حیثیت کا مالک ہے۔

فراق گورکھپوری

قتیل شفائی کے گیتوں کا امتیازی وصف ان کی کھنک اور جھنکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رقص اور گیت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور گیت کی لے میں رقص کرتے ہوئے قدموں کی جھنکار بھی شامل ہوتی ہے لیکن جس طرح رقص کی جھنکار نے قتیل کے گیتوں کا احاطہ کیا ہے اس کی مثال عام طور سے ناپید ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

قتیل کی شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ غزل اور گیت ان کا خاص میدان ہے ان دو شعری جہانوں کے علاوہ ان کی دھاک ہے' ایک اور فیلڈ میں بھی ہے اور وہ ہے فلمی شاعری جسے انھوں نے ادبی شاعری کے قریب تر کر دیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

قتیل کے گیتوں میں جذبات کی رم جھم کا سماں بڑا دل نواز ہوتا ہے۔ یہی سماں ان کی غزلوں کو بھی ایک خاص سوز اور گہرائی عطا کرتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب

جناب قتیل صاحب

بیسویں صدی کے بھاری بھرکم شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ گذشتہ پچاس برس سے آپ بانسری بدست ہو کر غزل، نظم اور گیت بلا تکان تحریر کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سیاحت بھی بلا مبالغہ بے پناہ کر رہے ہیں۔ ایک چکر ہے آپ کے پاؤں میں۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ اپنی گنجان مصروفیت کے باعث آپ اس جانب مطلق دھیان نہیں دے سکے ہوں گے کہ بیسویں صدی کی بزم بہت جلد برخاست ہونے والی ہے اور اس کی جگہ پر نشست جمانے کے لیے اکیسویں صدی نے ممکن حد تک تیاری مکمل کر لی ہے۔ ایک بزرگ باراں دیدہ نے اکیسویں صدی کے تیور اور کرتوت اپنی چشم تصور سے دیکھ کر بڑے وثوق اور دل گردے سے انکشاف کیا ہے کہ نئی صدی ان گنت تند خو تقاضے اور بے کٹے بلے گلے ساتھ لائے گی جن کی وجہ سے رخ ارض پر سرنگنک تبدیلیاں اٹھیں گی۔ تب امارت کے جبہ و دستار بدل جائیں گے۔ سیاست کے انداز و اطوار بدل جائیں گے۔ صحافت کے دشنہ و تلوار بدل جائیں گے۔ شرافت کے کوچہ و بازار بدل جائیں گے۔ محبت کے معیار اور سنگھار بدل جائیں گے۔ تجارت کے ہتھکنڈے اور ہتھیار بدل جائیں گے۔ خاک خوروں کے لیڑے اور لنگار بدل جائیں گے۔ سوچ سو فنون لطیفہ کے نقش و نگار بدل جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بایں سبب آپ دیگر دلچسپیاں تج کر نئی صدی کے مطالبات و تغیرات کا بنظر عمیق جائزہ لیں اور فی الفور ایک ایسی نادر نقوش والی نظم یا غلافی آنکھوں والی غزل یا گلو ملو سا گیت تخلیق کریں جو روبٹ اور کمپیوٹر کے مقابلہ پر انسان کو رہتی صدی تک شکست سے مامون و محفوظ رکھے۔ ہو سکتا ہے میرے مطلع کرنے سے قبل ہی آپ کو نظم یا غزل آ رہی ہو۔

چپ چپ پڑے ہو ضرور کوئی بات ہے

ضیا ساجد